دار و رسن

کیفی اعظمی کی شاعری

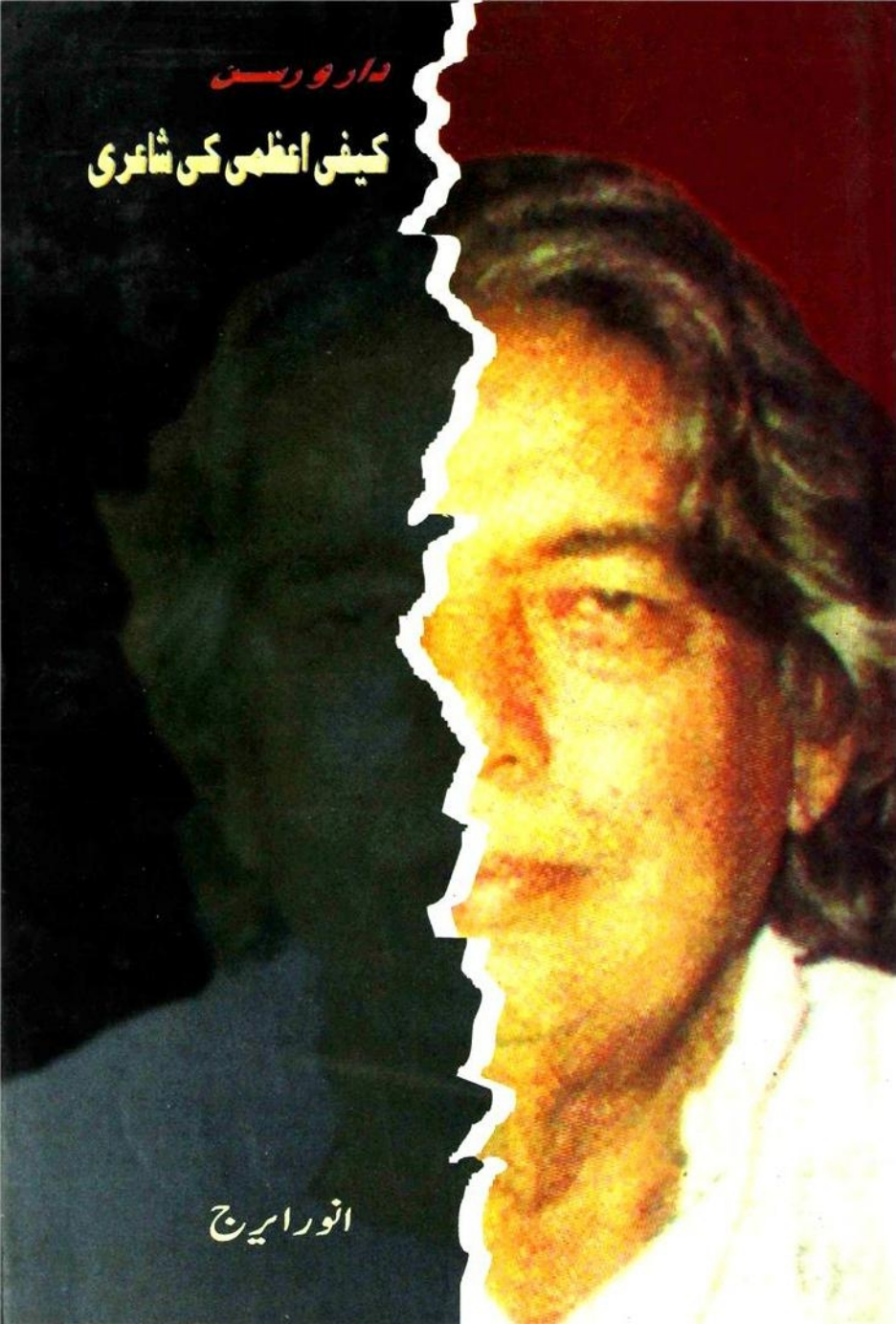

انور ایرج

دار و رسن

کیفی اعظمی کی شاعری

ڈاکٹر انور ایرج

جرس پبلیکیشن
پٹنہ / جھارکھنڈ

انہیں آرام کی ضرورت تھی۔

دوسرے دن صبح جلد ہی اٹھ گیا تو ان کے ماتھے پر تلک کا مطلب بھی سمجھ میں آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ گاؤں کے لوگ آتے اور پاؤں چھوکر ان کا آشیرواد لیتے اور ان کو تلک لگا کر رخصت ہوتے۔ وہیں پر ان کے والد مرحوم کی پتھر سے بنی ہوتی مورتی پر بھی لوگ تلک لگاتے اور جھک کر پرنام کرتے۔ شاید یہ ان کا روز کا معمول تھا' یا درگا پوجا کی وجہ سے یہ سب کچھ ہو رہا تھا' کہہ نہیں سکتا۔ اس گاؤں میں مسلمانوں کی آبادی بہت کم ہے۔ جو بھی ہو میں سمجھ گیا تھا کہ ان کا مذہب انسانیت کا ہے' جس طرح پیر' فقیر اور سنت سب کے ہوتے ہیں' یہ بھی سب کے ہو چکے ہیں۔ ناشتے کے بعد بات چیت ہوتی رہی' انہوں نے رانچی اپٹا کے بارے میں پوچھا کہ وہاں اپٹا کا کیا حال ہے۔ میں نے اپٹا کے بارے میں انہیں تفصیل سے بتایا' اور یہ بھی بتایا کہ رانچی اپٹا کے کلاکاروں کو لے کر ایک فلم بنائی جا رہی ہے۔ فلم کا نام 'تانیا' ہے اس میں پرکشت ساہنی' منجامن گیلانی' نینا گپتا اور نتاشا سنہا کے علاوہ رانچی کے کئی کلاکار اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ اس فلم کے ہدایت کار کلکتہ اپٹا کے کرن سین ہیں۔ اس فلم کے لئے بہت سارے گیت لکھے گئے تھے۔ مگر میرے ہی گیت کو ہدایت کار نے پسند کیا' جیسے شاید انوراد ھا پوڈوال کو گانا ہے۔ اس فلم میں ڈائیلاگ اور اسکرین پلے رانچی کے ہی ابرار احمد نے لکھا ہے۔ فلم نوریل بن چکی ہے۔ اس کا پریس کانفرنس کلکتہ میں منعقد ہوا' جس میں میں بھی شامل تھا۔ کلکتہ کی پوری اپٹا ٹیم پہنچی ہوئی تھی۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ صلاحیتوں کی قدر اس طرح بھی ہوتی ہے۔ مجھے ایک بھیڑ نے گھیر لیا اور گیت کی تعریف کرنے لگے۔ کیونکہ ہدایت کار نے گیت کی تعریف کرتے ہوئے لوگوں کو بتایا تھا کہ فلم کے تینوں گیت چار پانچ گھنٹے کے اندر لکھی گئی ہے۔ اس کانفرنس میں شاید گلزار بھی آئے تھے' لیکن ان سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ پرکشت ساہنی نے گیت اور ڈائیلاگ کی تعریف کرتے ہوئے ہم دونوں یعنی ابرار احمد اور مجھے ممبئی آنے کی دعوت دی اور کہا کہ جب بھی آپ آئیں' تو مجھ سے ضرور ملیں۔ آپ جیسے لوگوں کی ضرورت کافی بڑھ گئی ہے۔ اس پر کیفی صاحب نے کہا کہ ہاں اب انڈسٹری میں لکھنے پڑھنے والوں کے لئے کافی اسکوپ بڑھ گیا ہے۔ اگر آپ اپنے کام سے مطمئن ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ وہاں بھی کام کی کمی نہیں ہے۔ کیفی صاحب بہت خوش تھے کہ رانچی اپٹا بہت تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ آزاد غنی' شمپا' سامول دا اور شالینی سنویدنا (منی) نے اس کے لئے کافی محنتیں کی تھیں۔ اس طرح ان سے باتیں ہوتی رہیں اور مقالے کا کچھ کچھ حصہ انہیں وقفے وقفے سے سناتا رہا۔ وہ مجھے بار بار ڈاکٹر صاحب کہہ کر مخاطب کرتے' میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ مجھے صرف بیٹا کہیں تو زیادہ خوشی ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ بیٹا اگر ڈاکٹر ہو جائے' تو باپ کو ڈاکٹر ہی کہنے میں زیادہ

■ اردو نظم کی خصوصیات اور کیفی اعظمی

یوں تو نظمیں مختلف ہیئتوں میں ملتی ہیں۔ قدیم اصناف میں مثنوی اور مسدس دو مقبول اور ممتاز ہیئتیں ہیں۔ مگر قدماء اور کلاسیکی شعراء کے یہاں اس کے علاوہ بھی چھوٹی بڑی نظمیں موجود ہیں۔ مختصر نظموں میں فائز دہلوی کی جوگن' کاچن اور بھنگیڑن کا نام لیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ شکل وصورت اور ہیئت کے اعتبار سے مثنوی معلوم ہوتی ہے۔ نظیر اکبرآبادی کے یہاں خصوصیت سے اردو کا یہی قدیم رنگ روپ موجود ہے' جس میں ضابطہ اور اصول کی پیروی دکھائی دیتی ہے۔ 'جاڑے کی بہاریں' 'برسات کی بہاریں' 'ہولی' یا پھر 'روٹی نامہ' یا 'آدمی نامہ' وغیرہ۔ نظم کی ہیئت کے اعتبار سے ان کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ہمیں نظموں کے ارتقائی مدارج کو سمجھنے میں معاون ہوتی ہیں۔ مثنوی کی جو خصوصیت ہے اس اعتبار سے نظیر کی نظموں میں موضوع کی اکائیت اور تسلسل' تفصیلات و جزئیات' ابتداء مرکزی خیال' اس کی وضاحت اور منطقی انجام برابر دکھائی دیتا ہے۔ دراصل یہ مثنویاں نہیں ہیں' انہیں ہم چھوٹی یا بڑی مثنوی نہیں کہہ سکتے۔ یہ پابند نظمیں ہیں۔ جن میں ردیف اور قافیے کی پابندی ہوتی ہے' یہ پابندیاں غزل میں نہیں ہوتیں وجہ یہ ہے کہ یہ غزل کی ہیئت سے بالکل مختلف ہے۔ اردو نظم کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ نظیر' حالی اور محمد حسین آزاد تک اس نے مسلسل ترقی کی' موضوعات کے اعتبار سے بھی اور ہیئت کے اعتبار سے بھی۔ نظم موضوعاتی اظہار کے لئے سب سے زیادہ کارگر اور موثر ثابت ہوئی ہے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں حالی' شبلی اور آزاد کے بعد اردو کے دو بڑے شاعروں نے پابند نظم کے فن کو کمال تک پہنچایا۔ اقبال اور جوش نظم کے دو ایسے بڑے شاعر ہیں' جنہیں نظر انداز کر دیا جائے تو نظم نگاری کی تاریخ ہر اعتبار سے ادھوری ہوگی۔ اردو کی چند بہترین اور اعلیٰ نظموں میں ان دونوں شعراء کی نظمیں شامل ہیں' ان کے سلسلے میں یہ بات دعوے کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اردو شاعری میں گر ان کا وجود نہ ہوتا' تو ہماری گزشتہ ساٹھ سال کی شاعری میں نظم نگاری کی تاریخ بڑی کمزور ہوتی۔

جو بات اصناف سخن سے متعلق مشاہدے میں آچکی ہے' کہ ہر صنف سخن دوسری صنف سخن

سے کہیں نہ کہیں الگ اور متغائر ہوتی ہے۔ اس کی وجہ اصناف میں مشتمل لفظیات کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ ہر صنف کی ایک مخصوص ہیئت ہوتی ہے۔ جو اپنے اظہار کے لئے ایک خاص لفظیات کا ہی انتخاب کرتی ہے۔ جس سے اس کی داخلی و خارجی ہیئت و کیفیت اور اس کے انفرادی یا متفرق اسالیب ظاہر ہوتے ہیں۔ مرثیہ ہو یا قصیدہ، غزل ہو یا نظم، مثنوی ہو یا مسدس اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے ایک مخصوص لفظیات چاہتے ہیں۔ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ ہر اصناف کی ہر دلعزیزی ایک جیسی نہیں۔ مرثیہ، مثنوی، قصیدہ وہ اصناف سخن ہیں جو غزل کے تسلط کے عہد میں بھی کامیاب اور سربلند نظر آتی ہیں۔ لیکن شاید ہی کسی کو اس بات سے انکار ہو کہ جب حالات بدلے، فرد سے فرد کے ربط وانس یا اس کے تقاضے بدلے تو ہمارے تصورات بھی بدل گئے۔ جہاں عقیدتیں لرزاں ہوئیں اور نئے افکار کے ساتھ ساتھ مختلف نظریات بھی سامنے آئے۔ لہٰذا ایسی صورت میں نظم نے دوسرے اصناف کے مقابلے زیادہ مقبولیت حاصل کرلی۔ اسی لئے ہمارے بیشتر شعراء نے اپنے افادی اظہار کے لئے نظم اور گیت کی ہیئتوں کو قبول کیا۔ غزل کی ہیئت کو چھوڑ کر جدید نظم کو وسعت بخشی اور اس کے امکانات کو مزید روشن کیا۔ اس سلسلے میں سلیم شہزاد اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں: [1]

> "قلم برداشتہ قسم کی تنقید نے اس کے جن عمودی موضوعات کی دریافت کی ہے ان کی فہرست میں فرد کی تنہائی، ذات کا غم، احساس زیاں، خوابوں کی شکست، بے چہرگی، بے سمتی اور بے زمینی وغیرہ بآسانی پہچان لئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ نہ ختم ہونے والی فہرست ہے کہ ہر جدید نظم گو کے یہاں ان موضوعات کے علاوہ متعدد دوسری ذات اور کائنات کے مسائل پائے جاتے ہیں۔ پھر متغیر عصر کے اثرات بھی وہ قبول کرتا ہے اور متغیر عصر کے جذبات سے وہ ذاتی حیثیت سے گذرتا بھی ہے۔"

مذکورہ اقتباس کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ نظم کی حدیں محدود نہیں ہیں، لفظیات اور موضوعات سے اس کی احاطہ بندی ممکن نہیں۔ ایسا اس لئے ہے کہ جدید نظم کا سب نمایاں رجحان اس کی لاحاصلی کا ہے۔ جس کی لفظیات مختلف النوع خیالات وتصورات سے ماخوذ ہوتی ہیں۔ نظم کی بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ کسی خاص موضوع کی تفصیلات اور جزئیات ہنرمندی کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ یہاں ایک شعر میں سب کچھ بیان کرنے کی مجبوری نہیں ہوتی بلکہ اشعار کے طویل تسلسل میں نظم اپنے موضوع کو محاکات اور

پیکر کی شکل عطا کرتی ہے۔ جو پڑھنے والے کے ذہن کو اپنے موضوع کی طرف آسانی سے موڑ کر گرفت میں لے لیتی ہے۔

اردو نظم نگاری کی روایت اور خصوصیات کی روشنی میں جب کیفی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو چند باتیں وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہیں کہ کیفی کی شناخت غزل سے نہیں نظم سے بنتی ہے اور وہ نظم کے بڑے کامیاب شاعر ہیں۔ کیفی کی نظر میں شعر و ادب کا ایک واضح مقصد ہے کہ ادب حقیقت سے قریب ہو اور زندگی کا ترجمان بنے۔ ہمارے روز مرہ کے مسائل' ہماری بے زمینی' بے چہرگی اور انسانی شکست وریخت کی داستان شعر و ادب کے حوالے سے بھی سامنے آئے' اور ادب آئینہ دار بن کر زمانے کا چہرہ سامنے لائے۔ جہاں ذات اور کائنات کی حسیت کا مشاہدہ ممکن ہو۔ لہٰذا عصر کے متغیر حالات و موضوعات کے افادی اظہار کے لئے انہوں نے نظم اور گیت کی ہیئت کو ہی سب سے زیادہ مناسب جانا۔

کیفی کی شاعری کے مطالعے کے دوران ایک بہت دلچسپ بات سامنے آئی کہ کیفی کی شاعری کے سلسلے میں جو اعتراضات اب تک سامنے آئے' یا جن باتوں کو بنیاد بنا کر کیفی کی شاعری کو کمزور ثابت کرنے کی ناکام کوششیں ہوئیں اور عصبیت کی وجہ سے جو تنقیدیں اور دلیلیں سامنے آئیں۔ وہ دلیلیں اب سند کی محتاج نظر آتی ہیں۔ ان پر احتجاج' مقصدیت' خطابت' جوش' خارجی اثرات' سماجی رجحان' موضوعاتی اور اشتعال انگیزی جیسے کئی الزامات صادر کئے گئے اور ان کی شاعری کو پروپگنڈہ اور نعرہ بازی کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوششیں بھی ہوئیں۔ لیکن آپ جب ادب عالیہ میں شمار ہونے والی کامیاب شاعری کو دیکھیں گے' تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ مذکورہ نکات جو وہاں کمال کا درجہ رکھتے ہیں' ان کی شاعری کے لئے عیب بن گئے۔ شاعری کو اوج کمال تک پہنچانے میں یہ خصوصیات معاون ثابت ہوتی ہیں۔ اس بات کو کیفی اچھی طرح جانتے تھے اس لئے وہ ایسی تمام باتوں سے بے نیاز ہو کر اپنی شاعری کا رشتہ زندگی سے استوار رکھتے ہوئے' زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کی سعی کرتے رہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ کیفی کی شاعری میں کمزوریاں نہیں ہیں' مگر یہ بات دعوے سے کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی شاعری یا فلاں کی شاعری میں فنی کمزوری ہے ہی نہیں۔ غالب یا میر کی کسوٹی پر نظیر کی شاعری جس طرح کھری نہیں اتر سکتی' اسی طرح نظیر کے شعری میزان پر غالب اور میر کی شاعری بھی کھری نہیں اترے گی۔ بات بالکل وضاحت کے ساتھ سامنے ہے' کہ جس طرح ان کی دنیا الگ ہے' اسی طرح ان کی دنیا بھی مختلف ہے۔ ادوار' افکار' تقاضے' لفظیات' طرز اظہار سب کچھ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لہٰذا ایمانداری کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہر شاعر کو انہیں کے شعری پیمانے پر پرکھا جائے یا پھر شعری خصوصیات

کی بنیاد پر ان کی شاعری کا جائزہ لیا جائے۔

میں نے اپنے تحقیقی مقالے میں ایک جگہ ان کی شاعری کا جائزہ انہیں کے شعری میزان کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ جن میں درج بالا نکات کو یعنی ادوار' افکار' تقاضے' لفظیات اور طرز اظہار کو ہی کسوٹی کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ جہاں وہ بہت کامیاب شاعر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ لیکن یہاں پر نظم نگاری کی خصوصیات کی بنیاد پر ان کی شاعری کا ایک عمومی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کی شاعری نظم نگاری کی خصوصیات پر کھری اترتی ہے یا نہیں۔

اردو ادب کے دو بڑے اور اہم نقاد جنہوں نے اردو ادب کو ایک تنقیدی شعور عطا کیا جن کی اہمیت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو وہ حالی اور شبلی ہیں۔ ان کے شعر سے متعلق تنقیدی فرمودات ہمارے سامنے ہیں۔ انہیں فرمودات کی روشنی میں کیفی کی شاعری کا ایک جائزہ پیش کرنے کی سعی کروں گا' تا کہ ان کی شاعری کے معائب و محاسن کھل کر سامنے آئیں۔ شعری خصوصیات سے متعلق مقدمہ شعر و شاعری میں حالی فرماتے ہیں' عنوان ہے ''شعر کا حسن قبول'' ۲

> "تاریخ میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ شعراء نے اپنی جادو بیانی سے لوگوں کے دلوں پر فتح نمایاں حاصل کی ہے۔ بعض اوقات شاعر کا کلام جمہور کے دل پر ایسا تسلط کرتا ہے کہ شاعر کی ہر ایک چیز یہاں تک کہ عیب بھی خلقت کی نظر میں مستحسن معلوم ہونے لگتے ہیں اور لوگ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ آپ بھی ان عیبوں سے متصّف ہو کر دکھائیں۔"

دوسری جگہ حالی 'پولیٹکل معاملات میں شعر سے بڑے بڑے کام لئے گئے ہیں' کے عنوان سے چار مثالیں پیش کی ہیں۔ ملاحظہ ہو مقدمہ شعر و شاعری کا صفحہ ۸۵'۸۶'۸۷ 'شاعری سوسائٹی کے تابع ہے' اس عنوان سے حالی فرماتے ہیں: ۳

> "باوجود ان تمام باتوں کے جو کہ شعر کی تائید میں کہی گئی ہیں' ممکن ہے کہ سوسائٹی کے دباؤ یا زمانہ کے اقتضا سے شعر پر ایسی حالت طاری ہو جائے کہ وہ بجائے اس کے قومی اخلاق کی اصلاح کرے' اس کے بگاڑنے اور برباد کرنے کا ایک زبردست آلہ بن جائے۔ قاعدہ ہے کہ جس قدر

سوسائٹی کے خیالات' اس کی رائیں' اس کی عادتیں' اس کی رغبتیں' اس کا میلان اور مذاق بدلتا ہے اسی قدر شعر کی حالت بدلتی رہتی ہے اور یہ تبدیلی بالکل بے معلوم ہوتی ہے' کیونکہ سوسائٹی کی حالت کو دیکھ کر شاعر قصداً اپنا رنگ نہیں بدلتا' بلکہ سوسائٹی کے ساتھ ساتھ خود بخود بدلتا چلا جاتا ہے۔"

'بُری شاعری سے سوسائٹی کو کیا کیا نقصان پہنچتے ہیں' اس عنوان سے حالی رقم طراز ہیں:۴

"اگرچہ شاعری کو ابتداً سوسائٹی کا مذاق بگاڑتا ہے۔ مگر شاعری جب بگڑ جاتی ہے تو اس کی زہریلی ہوا سوسائٹی کو بھی نہایت سخت نقصان پہنچاتی ہے' جب جھوٹی شاعری کا رواج تمام قوم میں ہو جاتا ہے تو جھوٹ اور مبالغہ سے سب کے کان مانوس ہو جاتے ہیں۔ جس کے شعر میں زیادہ جھوٹ یا نہایت مبالغہ ہوتا ہے۔ اسی کی شاعری کو زیادہ داد ملتی ہے۔ وہ مبالغہ میں اور غلط کرتا ہے تاکہ اورزیادہ داد ملے' ادھر اس کی طبیعت راستی سے دور ہوتی جاتی ہے اور ادھر جھوٹی اور بے سروپا باتیں وزنی قافیہ کے دلکش پیرایہ میں سنتے سنتے سوسائٹی کے مذاق میں زہر گھل جاتا ہے۔ حقائق و واقعات سے لوگوں کو روز بروز مناسبت کم ہوتی ہے۔ عجیب و غریب باتوں' سو پر نیچرل کہانیوں اور محال خیالات سے دلوں کو انشراح ہونے لگتا ہے۔ تاریخ کے سیدھے سادے وقائع سننے سے جی گھبرانے لگتے ہیں۔"

'شعر میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں' حالی کے توسط سے سنیں:۵

"ملٹن نے ان کو چند مختصر لفظوں میں بیان کیا ہے وہ کہتا ہے کہ شعر کی خوبی یہ ہے کہ سادہ ہو' جوش سے بھرا ہوا ہو' اور اصلیت پر مبنی ہو' ایک یوروپین محقق ان

لفظوں کی شرح اس طرح کرتا ہے 'سادگی سے صرف لفظوں ہی کی سادگی مراد نہیں بلکہ خیالات بھی ایسے نازک اور دقیق نہ ہونے چاہئیں جن کے سمجھنے کی عام ذہنوں میں گنجائش نہ ہو۔ محسوسات کے شارع عام پر چلنا بے تکلفی کے سیدھے رستے سے ادھر ادھر نہ ہونا اور فکر کو جولانیوں سے باز رکھنا اسی کا نام سادگی ہے۔ علم کا رستہ اس کے طالب علموں کے لئے ایسا صاف نہیں ہو سکتا جیسا کہ شعر کا رستہ اس کے سامعین کے لئے صاف ہونا چاہئے۔"

'سادگی سے کیا مراد ہے' حالی کی زبانی سنیں: ۶

"یہ سچ ہے کہ جو عمدہ کلام ایسا صاف اور عام فہم ہو کہ اس کو اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک ہر طبقہ اورہر درجہ کے لوگ برابر سمجھ سکیں اور اس سے یکساں لذت اور حظ اٹھائیں' وہ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کو سادہ اور سہل کہا جائے۔ مگر کوئی ایسی نظم جس کا ہر شعر عام فہم و خاص پسند ہو' خواہ اس کا لکھنے والا ہومرہو یا شیکسپیئر ہو' نہ آج تک سرانجام ہوئی ہے' اورنہ ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو شیکسپیئر کے ورکس پر شرحیں لکھنے کی کیوں ضرورت ہوتی۔"

'اصلیت سے کیا مراد ہے' اس عنوان سے حالی کا بیان ملاحظہ ہو: ۷

"اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہر شعر کا مضمون حقیقت نفس الامری پر مبنی ہونا چاہئے۔ بلکہ یہ مراد ہے کہ جس بات پر شعر کی بنیاد رکھی گئی وہ نفس الامر میں لوگوں کے عقیدہ میں یا محض شاعر کے عندیہ میں فی الواقع موجود ہے۔"

'جوش سے کیا مراد ہے' حالی فرماتے ہیں: ۸

"جوش سے یہ مراد ھے کہ مضمون ایسے بے ساختہ الفاظ اور موثر پیرایہ میں بیان کیا جائے جس سے معلوم ہو کہ شاعر نے اپنے ارادہ سے مضمون نہیں باندھا بلکہ خود مضمون نے شاعر کو مجبور کرکے اپنے تئیں اس سے باندھوایا ھے۔"

'عبرانی اور عربی شاعری میں سب سے زیادہ جوش تھا' حالی یوروپین محقق کا قول نقل کرتے ہیں: ۹

"عبرانی شاعروں کے کلام میں اس قدر جوش ھے کہ ان کا شعر سن کر یہ معلوم ہوتا ھے گویا صحرا میں ایک تناور درخت جل رہا ھے یا ایک شخص پر وحی نازل ہو رہی ھے۔"

درج بالا فرمودات کی روشنی میں شعر کی خوبی اور خامی سے متعلق حالی نے جو نکات سامنے لائے ہیں' ممکن ہے کہ کسی کو ان نکات پر اعتراض ہو' میں اس تفصیل یا بحث میں گئے بغیر یہ مانتا ہوں کہ جو تنقیدی پیمانہ حالی نے اردو شاعری کو عطا کیا ہے۔ وہ آج بھی مشعل راہ ہے۔

مذکورہ چند اقتباسات کی روشنی میں آپ یہ ضرور دیکھیں کہ کیفی کی شاعری میں وہ شعری سچائیاں یا وہ خوبیاں موجود ہیں کہ نہیں جو شعری تنقید کے تقاضے ہیں۔ اگر کیفی کی شاعری اس تقاضے کو پورا کرتی ہے تو ان سے متعلق تمام اعتراضات خود بخود بے وقعت ہو جاتے ہیں۔

کیفی اپنی بیشتر شاعری میں عوام سے مخاطب ہیں۔ شاید اسی لئے وہ خارجی اثرات اور حالات سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے سامنے عوام کے مسائل سے متعلق ایک موضوع ہوتا ہے' موضوع سے متعلق مقصد ہوتا ہے' جو سماجی رجحان کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس نمائندگی کے لئے جادو بیانی اور جوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ جسے وہ بروئے کار لا کر عوام کے دلوں پر حکمرانی کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں' اور ان کا کلام بھی جمہور کے دل پر مسلط نظر آتا ہے' اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کی صدا' صدا بہ صحرا ثابت ہوتی اور وہ اتنے کامیاب اور مقبول کبھی نہ ہوتے۔ حالی کلام کے تاثر اور تسلط کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ اگر شاعر اس میں کامیاب ہے تو خلقت کی نظر میں معائب بھی محاسن بن جاتے ہیں۔ ان عیبوں پر کیڑے نکالنا آسان ہے مگر ان عیبوں سے متصف ہونا بہت دشوار ہے۔ کیفی کے ساتھ معاملہ کچھ برعکس نظر آتا ہے۔ یہاں عصبیت کچھ ایسی ہے کہ محاسن' معائب سے مبدل ہو جاتے ہیں۔

بعض حضرات کی نگاہ میں ایسی شاعری اس لئے بے کار ہے کہ اس میں سیاسی رنگ حاوی ہے۔ اس سلسلے میں حالی نے چار عمدہ مثالیں پیش کی ہیں اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ "پولیٹکل معاملے میں

شعر سے بڑے بڑے کام لئے گئے ہیں'' آپ کیفی کی شاعری میں رچا ہوا سیاسی شعور دیکھیں گے اور یہ بھی دیکھیں گے کہ ان کی سیاسی گفتگو عوام کے مفاد کے لئے ہے' نہ کہ ذاتی مفاد کے لئے ان کی شاعری میں عوام کا دکھ بولتا ہے۔ کیفی کی شاعری احتجاج سے لیس ہے' وہ سرمایہ دارانہ نظام اور فاشزم کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ مزدور اور استحصال زدہ عوام کے دکھوں کا مداوا چاہتے ہیں۔ ان کے زخموں پر مرہم چاہتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی شاعری کا مطالعہ کریں' تو ان کی سیاسی ایمانداری سر چڑھ کر بولتی نظر آئے گی۔

حالی نے شاعری کو سوسائٹی کے تابع کہا ہے۔ کیفی کی شاعری کا بیشتر حصہ اسی سوسائٹی کا تابع دار نظر آتا ہے' انہوں نے سماج یا سوسائٹی کے مسائل سے کبھی چشم پوشی نہیں کی' وہ ہمیشہ سماجی مسائل سے نبرد آزما رہے اور اپنی شاعری کو ہمیشہ سوسائٹی اور سماج کے تقاضوں کے مطابق ڈھالتے رہے ہیں' سماج کی رائیں' اس کی عادتیں' اس کی رغبتیں' اس کا میلان اور مذاق جیسے جیسے بدلتا رہا' کیفی کی شاعری ان کے ساتھ ساتھ چلتی اور بدلتی رہی اور وہ اپنی شاعری کو خوش آئند مستقبل کا آلہ کار بنانے کی سعی کرتے رہے۔ جہاں اچھی شاعری سے سوسائٹی کو بے شمار فائدے حاصل ہوتے ہیں' وہیں بری شاعری سے سوسائٹی کو نقصان بھی پہنچتا ہے۔ اچھی اور بری شاعری کو حالی نے یوں واضح کیا کہ جس ادب میں یا شاعری میں جھوٹ اور مبالغہ راہ پا جائے' وہ شاعری اچھی اور نفع بخش ہو ہی نہیں سکتی۔ کیفی کو جھوٹ اور مبالغے سے دور کا واسطہ نہیں' جو دیکھتے ہیں' جو محسوس کرتے ہیں اور جس کا وجود مستحکم ہے' اسے ہی اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں۔ وہ کسی جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا کر پیش نہیں کرتے' نہایت صاف گوئی کے ساتھ حقائق بیان کرتے ہیں' اس لئے بعض حضرات ان کی شاعری کو statement بھی کہہ دیتے ہیں اور بعض موضوعاتی اور لمحاتی شاعری کا لیبل چسپاں کر کے خوش ہوتے ہیں۔ فنکار تو سب ہوتے ہیں' اگر سچا نہ ہو' تو فنکار اداکار بن جاتا ہے' اور اس اداکاری میں وہ اپنا کردار بھی بھول جاتا ہے۔ کیفی اپنا کردار نہیں بھولتے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی موضوعاتی اور لمحاتی شاعری کا تعلق صدفی صد حقیقت سے ہے' اور اس حقیقت کا تعلق ان کے فن سے ہے۔ لہٰذا کیفی کی حقیقت پسند شاعری' عوام کو حقائق و واقعات سے قریب کرتی ہے۔ ابہام' تخیلات اور تشبیہات کے چور دروازے سے جن لوگوں نے جھوٹ اور مبالغے کو داخل کر دیا' جس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا ان کی نظر میں وہ شاعرانہ کمال بن گیا۔ جب کہ ایسی شاعری سے سوسائٹی کے مذاق میں زہر گھلتا ہے' اور حقائق و واقعات سے لوگوں کی مناسبت بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ محض داد و تحسین کی خاطر یہ کارنامہ انجام پاتا ہے۔ کیفی سوسائٹی کو جھوٹ کا زہر نہیں پلاتے بلکہ حقائق سے روبرو کرتے ہوئے' انہیں ذہنی طور پر ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے

لئے تیار کرتے ہیں۔ ایسی ہی شاعری کو حالی نے اچھی شاعری سے تعبیر کیا ہے۔

سادگی، جوش اور اصلیت سے متعلق مذکورہ اقتباسات کی روشنی میں کیفی کی شاعری کا جائزہ ہمیں یہ بتاتا ہے، کہ کیفی کے یہاں یہ تینوں خوبیاں اپنے کمال اور ہنرمندی کے ساتھ موجود ہیں۔ کیفی کا شعری اساس حقائق پر مبنی ہے، وہ اپنی شاعری میں غیر فطری بات نہیں کرتے اور نہ ہی ان کے خیالات اتنے دقیق، نازک اور علامتی ہوتے ہیں، جن کے سمجھنے میں عام ذہنوں کو دشواری ہوتی ہو، وہ اپنی بات ہمیشہ کھل کر کہنے کے عادی ہیں۔ وہ اپنے اشعار کے ذریعہ درپیش مسائل کو نہایت سیدھے سادے انداز میں سامعین کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ جن کا تعلق اصلیت سے بہت مضبوط نظر آتا ہے۔ وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو شاعری ہوتی ہے، وہ خواب و خیال کی شاعری نہیں ہوتی۔ وہ اپنا رشتہ سنگین حالات و واقعات سے جوڑ کر سنجیدگی اختیار کر لیتی ہے، جس میں عوام کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ محسوسات کی یہ دنیا اسی وقت آباد ہوگی، جب کلام میں سادگی ہوگی اور ادق الفاظ کے استعمال سے پرہیز کئے جائیں گے، تبھی کوئی شاعری قلب عوام کی دھڑکن بن سکے گی۔ کیفی کی شاعری ان خوبیوں سے آراستہ نظر آتی ہے۔ بہت ممکن ہے، کچھ خاص پسند حضرات ان کی شاعری کو عامیانہ یا عام پسند شاعری کہہ کر ان کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں حالی نے بڑی اچھی بات کہی کہ 'ایسی نظم جس کا ہر شعر عام فہم، خاص پسند ہو، نہ آج تک سرانجام ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔'

میں نے اپنے مقالے میں بار بار اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ کیفی کی شاعری بلند آہنگی، جوش اور ولولے سے لبریز ہے۔ اسی جوش کی وجہ سے بعض حضرات کو ان کی شاعری میں کبھی کبھی چیخ کا گمان گذرتا ہے۔ یہ بات مان بھی لی جائے کہ ان کی شاعری میں چیخ و پکار کی ایک کیفیت ہے، تو یہ کیفیت کیوں ہے؟ ان کی چیخ میں محض آواز کا سر بلند نہیں ہوتا۔ بلکہ بلند آہنگی سے سوچنے کی کیفیت نمایاں ہے۔ کیفی کی چیخ کسی عام آدمی یا دیوانے کی چیخ نہیں، بلکہ ایک حساس، دور اندیش اور دردمند انسان کی چیخ ہے۔ جو مسلسل بیداری کے عمل میں ہے۔ ان کے سامنے ایسے حالات تھے، ایسے سماجی تقاضے تھے، جن پر وہ اہل پڑتے تھے۔ کیفی کی چیخ یا احتجاج وقت کے اہم تقاضوں کو پورا کرنے کا ہے۔ جس کے سامنے ایک واضح مقصد ہو، اس کی چیخ یا اس کا احتجاج یونہی نہیں ہوگا۔ انہوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جوش کا پیرایہ اختیار کیا۔ جس میں طنز اور نرمی دونوں شامل ہیں۔ اسی وجہ سے ان کا جوش ایک اعتدال کے ساتھ متوازن الفاظ میں سامنے آتا ہے۔ ان کی نظموں کے مطالعے سے یا ان کے موضوعات سے یہ محسوس ہوتا ہے، کہ انہوں نے مضمون کو اپنے ارادے سے نہیں باندھا، بلکہ خود مضمون نے انہیں مجبور کر کے بندھوایا ہے۔ یہ کیفیت ان کی شاعری میں ہر جگہ موجود ہے۔ جسے آپ شعر یا

شاعر کی بڑی خوبی کہہ سکتے ہیں۔

حالی کی تنقید نگاری کی روشنی میں کیفی کی شاعری کے عمومی جائزے کے بعد آیئے دیکھیں کہ شبلی کی بوطیقا شعری خصوصیات کے سلسلے میں کیا کہتی ہے؟ اور کیفی کی شاعری ان کی کسوٹی پر کہاں تک کھری اترتی ہے۔

مقالات شبلی' جلد دوم' ایک مقالے میں شاعرانہ بلاغت کے سلسلے میں' شبلی نے بڑی اچھی بات کہی' کہ مغرب والوں نے قدیم یونانی پس ماندہ تہذیب اور اس کے مظہر فنون سے بلاغت کا جو مفہوم قائم کر لیا۔ دراصل وہ بلاغت کا حقیقی مفہوم نہیں۔ انہوں نے قرآن حکیم کے اشاروں کو سامنے رکھا اور یہ بات واضح کی کہ شاعری کے فنی محاسن یا خوبی کیا ہیں۔ طوالت کو ملحوظ رکھتے ہوئے شاعری سے متعلق صرف دو اقتباس پر ہی اکتفا کروں گا۔!

"کلام کی خوبی صرف محاکات کا نام نہیں' کلام کی غرض و غائیت صرف سامعین کو محظوظ کرنا نہیں بلکہ عقل کی سفارت اور پیغامبری ہے۔ کلام سے جو لذت حاصل ہوتی ہے وہ اس لئے نہیں کہ کلام ایک قسم کی محاکات اور محاکات انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ نطق ایک قوت ہے اور قوت کے استعمال میں انسان کو خواہ مخواہ مزہ آتا ہے۔ انسان کا اعلیٰ خاصہ محاکات نہیں' بلکہ نطق ہے' کلام کی خوبی سچائی پر موقوف ہے۔"

دوسرا اقتباس:

"اہل عرب چونکہ شاعری کی حقیقت کو خوب سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے اس کا نام بھی ایسا رکھا جو خود شعر کی حقیقت پر دلالت کرتا ہے۔ شاعر کے لفظی معنی صاحب شعور کے ہیں۔ شعور احساس (فیلنگ) کو کہتے ہیں۔ یعنی شاعر وہ شخص ہے جس کا احساس قوی ہو' لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کو اوروں کی بہ نسبت زیادہ رنج یا زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہے کہ احساس کے وقت اس کی تمام قوتیں جوش میں آجاتی ہیں۔ احساس

خوشی ہوتی ہے۔ ویسے بھی آپ نے مقالہ لکھ کر معنوی بیٹے کا حق تو ادا کیا ہی ہے۔ میں ان کے جواب سے لاجواب ہو کر خاموش ہو گیا۔

دوپہر کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کیا پھر باہر برآمدے میں آ کر کیفی صاحب کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں' اسی درمیان میں نے ان کی شاعری پر کئے گئے اعتراضات کے بارے میں پوچھا' تو انہوں نے بہت کھل کر بات چیت کی اور بتایا کہ شاعری محض وقت گذاری اور لطف اندوزی کی چیز نہیں۔ شعر و ادب کا زندگی اور اس کے مسائل سے ایک گہرا رشتہ ہے' جو شاعری زندگی اور اس کے مسائل کی ترجمانی نہ کرے اور وقت کے اہم تقاضوں کو پورا نہ کرے' میرے نزدیک ادب اور زندگی دونوں سے مذاق کرنا ہے اور میں نے یہ نہیں کیا۔ میں نے ادب کے حوالے سے زندگی کو اور زندگی کے حوالے سے ادب کو سمجھنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش کی ہے۔ اسی طرح کی بات چیت ہوتی رہی' پھر انہوں نے مجھ سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ بھی شاعری کرتے ہیں اور رانچی کا مشاعرہ میرے ساتھ پڑھ چکے ہیں' کچھ سنائیے' میں نے کہا میں تو آپ کو سننے آیا ہوں' ٹھیک ہے آپ مجھے بھی سنئے گا۔ پھر میں نے دو چار غزلیں سنائیں' کچھ شعر پر تو وہ بالکل خاموش رہے' کچھ اشعار پر داد بھی دی اور کہا کہ دھیمی اور محنت سے شعر کہیں' تو آپ اچھی شاعری کریں گے۔ کیفی صاحب کی یہ بہت بڑی خوبی رہی ہے کہ وہ ہمیشہ نئی نسل کے شاعر اور ادیب کی حوصلہ افزائی کرتے رہے ہیں۔ پھر انہوں نے بھی اپنی دو بہت پیاری نظمیں سنائیں۔

میں اپنے ساتھ کیمرہ لے گیا تھا' ان کے ساتھ کئی تصویریں کھینچوائی' پھر ان کی لائبریری اور نئے پرانے دونوں گھر کی تصویر اتاری۔ شام مجھے لوٹنا تھا' کیفی صاحب' مجھے روکنا چاہتے تھے بار بار یہ کہتے رہے کہ ڈاکٹر صاحب میں آپ کو یہاں اچھا کھانا بھی نہیں کھلا سکا۔

لیکن آپ ایک بار بمبئی ضرور تشریف لائیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں آپ کی ملاقات سب سے ہو جائے اور اگر چھٹی ہے' تو میرے ساتھ ۱۹ اکتوبر کو بمبئی چلیں' اس کے پہلے بھی وہ کئی بار کہہ چکے تھے' کہ ڈاکٹر صاحب ٹکٹ بنوا دیں' میں نے نئی نوکری کی دہائی دیتے ہوئے' معذرت چاہی اور آنے کا وعدہ کیا' مگر افسوس میں ان کی زندگی میں بمبئی نہ جا سکا۔

رات کو تقریباً ۹ بجے مجھے پٹنہ کے لئے شاہ گنج سے ٹرین پکڑنا تھا۔ ان کی گاڑی سے شاہ گنج تک جانے کی بات تھی' لیکن ڈائنا موخراب ہو جانے کی وجہ سے اب مجھے پھول پور سے ہی ٹرین پکڑنا تھا۔ وقت بہت کم تھا۔ کیفی صاحب نے فون سے اسٹیشن ماسٹر کو کہا کہ میرے ایک بہت ہی عزیز مہمان' ابھی ٹرین سے شاہ گنج جائیں گے مگر انہیں پہنچنے میں تھوڑا وقت لگے گا' یہ کہہ کر انہوں نے فون رکھ دیا۔ میں

اس کی تخیئلہ کو نطق کو آوازکو لھجہ کو سب کو یک بارگی مشتعل کر دیتا ھے۔"

اقتباس اول میں صرف محاکات کلام کی خوبی نہیں اور نہ ہی کلام کی غرض و غائیت محض سامعین کو محظوظ کرنا ہے بلکہ عقل کی سفارت اور پیغامبری ہے۔ میں نے کیفی کی شاعری سے متعلق ایک جگہ لکھا ہے جس کا اعادہ مذکورہ اقتباسات کی روشنی میں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:[۱۱]

"شاعر کو وقت کا نقیب یا پیامبر اس لئے کہا جاتا ھے کہ وہ قیمتی لمحوں کا پارکھ اور اپنے وقت کا بناض ہوتا ھے۔ وقت کی نبض پر انگلی رکھ کے آنے والے وقتوں کا مزاج بتاتا ھے۔ کوئی وقت یا کوئی لمحہ اس بات کا متقاضی ھے کہ وہ ماضی کا حصہ بننے سے پہلے شاندار مستقبل کا پیش خیمہ بن جائے تو کیا وہ لمحہ اور وہ وقت صرف اس لئے ضائع کر دیا جائے کہ اس کے اظہار پر شاعری کا رتبہ کم ہو جائے گا یا صحافتی اور لمحاتی شاعری کا لیبل لگ جائے گا۔ اگر ایسا ھے تو پھر یہ قول غلط ثابت ہوگا کہ شاعر وقت کا نقیب اور پیامبر ہوتا ھے۔ یہ ادب کے نام پر ادب اور زندگی سے ایک قسم کی بددیانتی کے سوا اور کیا ہو سکتا ھے۔"

کیفی کی شاعری کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کی شاعری عقل کی سفارت اور پیامبری سے خالی نہیں ہے۔ محاکات بھی ان کی شاعری میں کامیابی کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ نطق کی قوت ہی انسان کو حیوان سے الگ کرتی ہے ورنہ انسان اور جانور میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ نطق ہی انسان کا اعلیٰ خاصہ ہے۔ اب اس نطق کا استعمال ایک عام آدمی اور ایک باشعور آدمی اپنے اپنے اعتبار سے کرتا ہے۔ باشعور آدمی کی نطق خود کے ساتھ دوسروں کو بھی مستفید کرتی ہے۔ یوں دیکھا جائے تو شاعری بھی نطق کا آلہ کار ہے اور شعر کی حقیقت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ شعر کہنے والا صاحب شعور ہے۔ جس کا احساس قوی عام آدمی کے مقابلے میں کمزور نہیں ہوتا ہے۔ وہ ایک عام آدمی کے مقابلے میں زیادہ حساس ہوتا ہے اور حساس لمحوں میں اس کی قوتیں جوش میں آجاتی ہیں۔

کیفی بھی انہیں حساس لمحوں میں مشتعل نظر آتے ہیں اور ان کی نطق کی قوتیں جوش میں آجاتی

ہیں، جو ان کی آواز کو اور لہجے کو متاثر کرتی ہیں، اور ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ وہ بے خبری کی دنیا میں نہیں جیتے اور نہ ہی انسانی احساسات سے الگ ہو کر صرف اپنے لئے زندہ رہنا پسند کرتے ہیں۔

حالی اور شبلی کی بوطیقا کی روشنی میں کیفی کا شعری مزاج اور اس کا رویہ وضاحت کے ساتھ سامنے آ چکا ہے۔ بہت ممکن ہے بعض حضرات حالی اور شبلی کی تنقید کو حرفِ آخر نہ سمجھیں۔ یہ سچ بھی ہے کہ ان کی تنقیدیں حرفِ آخر نہیں ہیں، لیکن اردو ادب میں ایسے معتبر نقاد کا فقدان ہے۔ اس لئے انہیں کو منتخب کرنا مناسب سمجھا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات مان لینے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہئے کہ کیفی کی شاعری نظم نگاری کی خصوصیات سے مملو ہے۔ نظم کے موضوع، ہیئت، خصوصیت، ابتداء و ارتقا کا اگر جائزہ لیں تو یہ بات بھی سامنے آئے گی کہ اردو کی نظمیں اپنے اندر وہ تمام تاریخی واقعات، حادثات و سانحات جو اس دنیا میں رونما ہوئے ہیں، اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں، اس لحاظ سے بھی کیفی کی نظمیں تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی بیشتر نظموں کے منظر نامے میں ان کے عہد کی سچائیوں کو دیکھا جا سکتا ہے، اور حالات و واقعات کا بخوبی اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ نظم کی کیفیت ہی اس پس منظر کو ظاہر کر دیتی ہے، جو کبھی ظہور پذیر ہوئے تھے۔ اور شاید یہی اعلیٰ ادب کی پہچان بھی ہے کہ ہم اپنے ادب کے ذریعے گذشتہ ادوار کا جائزہ لے سکیں۔ کیونکہ ادب ہی اپنے سماجی، سیاسی اور معاشی صورتحال کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ موضوع اپنے فورم کی تلاش خود کرتا ہے۔ اردو نظم نگاری کی تاریخ اس کی بہترین مثال ہے۔ جس کی خوبصورت ترین مثالیں ہمیں اقبال اور جوش کے یہاں ملتی ہیں۔ کیفی بھی اسی مضبوط اور صحت مند روایت کی بہت اہم کڑی معلوم ہوتے ہیں۔ ترقی پسند شاعری میں کیفی کا مقام بہت اونچا ہے۔ ان کے یہاں جوش وجذبے کی جو فراوانی اور موضوعات کے تقاضے و تنوعات ہیں اور اس سے ان کا جو احتجاجی شعور اور باغیانہ مزاج سامنے آتا ہے، ان کی گرفت کے لئے کیفی نے پابند نظموں کے فورم کو ہی زیادہ قابل اعتنا سمجھا اور اقبال و جوش کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

آخر کی چند سطروں میں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ جدید ادب کے اہم نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی جو نہ صرف ترقی پسند شعریات، فلسفہ ادب اور فلسفہء تخلیق سے ہی، بلکہ ترقی پسند کارنامے سے بھی شاعری کی حد تک پوری طرح انکار کرتے رہے ہیں۔ ان کا ایک مقالہ 'ادب اور اس کی غائیت' جو ماہنامہ 'نئی نسلیں'، کے ستمبر ۱۹۵۵ میں شائع ہوا ہے۔ آیئے اس مقالے کے ایک اقتباس کی روشنی میں بھی کیفی کی شاعری کو دیکھیں کہ ایک ترقی پسند شاعر ایک جدید نقاد کی کسوٹی پر کتنا کھرا اترتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو: ۱۲

"ادب کو زندگی سے مفر نہیں' ادب ہوا پہ یا ہوا میں نہیں رہ سکتا۔ ادب خوابوں کی دنیا کی تعمیر کا نام نہیں ہے' اور چاہے آپ میری دی ہوئی ادب کی تعریف کو ماننے سے انکار کر دیں' آپ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ ادب اور زندگی کا رشتہ اٹوٹ ہے۔ آج ہم اسی ادب کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں جن میں کسی فلسفہء حیات کی تبلیغ ہو یا کم سے کم اس میں نفسیاتی اور اخلاقی اقدار ہوں۔ فرانسیسی شاعر ورلائن (Verlaine) نے کہا تھا 'آج خواب کی دنیا کا رشتہ عمل کی دنیا سے ٹوٹ چکا ہے' دنیا جو شعراء کی بات سن کر گھبرا اٹھتی ہے' شعراء کو جلاوطن کر دیتی ہے' اسی لئے شعراء دنیا کو جلا وطن کر دیتے ہیں' ادیب کا کام اس صورت حال کو بدلنا ہے اور خواب کی دنیا کو حقیقت کی دنیا سے نزدیک لانا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ادیب اپنے قصر تخیل (Ivory Tower) سے باہر نکل کر دنیا کے مسائل کو سمجھنے اور ان کے مسائل کو سلجھانے کے لئے کسی فلسفہء حیات کی تبلیغ کردے اور یہ فلسفہء حیات کیا ہو یہ طے کرنا ادیب اور فلسفی کا کام ہے' نہ کہ نقاد کا۔ خدا پر ایمان اور یقین ایک خوش آئند جذبہ ہے جسے اپنانا ہمارے ادیبوں کا کام ہے۔"

محولہ گفتگو کی روشنی میں آپ دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ ان کی پوری شاعری زندگی سے عبارت ہے۔ ان کی شاعری ہوا میں معلق نظر نہیں آتی' نہ ہی ان کی شاعری کسی غیر مانوس علامت سے خواب کی دنیا تعمیر کرتی ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسی دنیا خلق کرتی ہے جس کا رشتہ زندگی سے ہے جو ہمیں خوابوں کے بجائے تلخ حقیقتوں سے روبہ رو کرتی ہے۔ بعض حضرات نے ان کی شاعری کو تبلیغ کہہ کر ادب کا واجبی حق بھی ادا کیا۔ حالانکہ ان کی شاعری میں فلسفہء حیات کی تفسیر زیادہ ہے تبلیغ کم ہے۔ ان کی پوری شاعری اخلاقی اقدار اور انسان دوستی کا بہترین نمونہ ہے۔

بلاشبہ کیفی نے اپنی شاعری سے اپنے عہد کے موجودہ صورت حال کو سمجھنے کی سعی کی ہے' اور خواب

کو حقیقت کا آئینہ دکھایا ہے۔ کیفی نہ اپنی ذات سے بے نیاز رہے اور نہ کائنات سے بیگانگی کا رویہ اختیار کیا۔ ذات کے مسئلے پر کائنات کے مسائل کو مقدم جانا' ان کے یہاں دنیا جلاوطن نہیں ہوتی' وہ ذات کی زمین سے کائنات کو بے دخل نہیں کرتے۔ ان کے افکار و نظریات' ان کے رنج و غم اور ان کی خوشیاں ذات کی بجائے کائنات سے زیادہ منسوب نظر آتی ہیں۔ ان کی پوری شاعری حیات و کائنات کی بہترین ترجمان ہے۔ انہوں نے حیات اور کائنات کے اس فلسفے کو ترقی پسند نظریہ کے حوالے سے طے کیا ہے۔ جس میں وہ بے حد کامیاب اور معتبر نظر آتے ہیں۔

نہایت اختصار کے ساتھ اس بات کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں' کہ اردو ادب کے دیگر تنقید نگاروں نے جو نظم نگاری کی خصوصیات بیان کی ہیں مثلاً حسن تخیل' مناظر فطرت کی عکاسی' واقعہ نگاری' محاکات' جذبات نگاری' حقیقت پسندی' موضوعات کا تنوع' سماجی رجحان' تجربات کا اظہار' مقصدیت' آزادی' انسان دوستی' صحت مند روایت کی پاسداری' ماضی کی یادگار' حال کا چہرہ' مستقبل کا اشاریہ وغیرہ۔ مذکورہ خصوصی عوامل اگر اچھی شاعری کی اساس بنتے ہیں' تو یقینی یہی اساس انہیں قدر دوام بھی بخشتی ہے۔ جس پر تمام نقاد متفق نظر آتے ہیں' اور ان کی بوطیقا کے حوالے سے بھی تقریباً یہی خصوصیات ابھر کر سامنے آتی ہیں۔

آپ مذکورہ نکات کو سامنے رکھ کر کیفی کی نظم دعوت' نیا حسن' مکان' ایک بوسہ' آوارہ سجدے' انتشار' چراغاں' زندگی' تم' تصور' دو راتیں' پشیمانی' مجبوری' اندیشے' نئے خاکے' سپردگی اور فتح برلن کا مطالعہ کریں' تو معلوم ہوگا کہ انہیں اہم بنیادوں پر ان کی شاعری کی عمارت کھڑی ہے' جو اچھی اور کامیاب نظم نگاری کی خصوصیات بتائی گئی ہیں۔ لہٰذا بہت وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ کیفی نے اپنے فن کے ساتھ مذاق نہیں کیا اور نہ ہی ان کے یہاں کلام کی غرض و غایت محض سامعین کو محظوظ کرنا اور داد و تحسین وصول کرنا ہے۔ بلکہ ان کے فن کا ایک مضبوط اور مربوط رشتہ زندگی اور زندگی کے احوال و کوائف سے رہا ہے۔ جسے اپنی شاعری میں انہوں نے برتا ہے' اور ان سے متعلق حقائق کو بہت قریب سے سمجھا بھی ہے' جو یقیناً ہمیں ایک خوش آیند زندگی کی بشارت دیتے ہیں۔

■

حوالہ جات و توضیحات :

۱۔ تعمیر ہریانہ، جدید تعلیم کی لفظیات۔ فروری ۱۹۸۶۔ ص ۲۲

۲۔ مقدمہ شعروشاعری، شعر کا حسن قبول، حالی۔ ص ۸۴

۳۔ مقدمہ شعروشاعری، شاعری سوسائٹی کے تابع ہے، حالی۔ ص ۹۴

۴۔ مقدمہ شعروشاعری، بری شاعری سے سوسائٹی کو کیا کیا نقصان پہنچتے ہیں، حالی۔ ص ۱۰۲

۵۔ مقدمہ شعروشاعری، شعر میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں، حالی۔ ص ۱۲۷

۶۔ مقدمہ شعروشاعری، سادگی سے کیا مراد ہے، حالی۔ ص ۱۲۹

۷۔ مقدمہ شعروشاعری، اصلیت سے کیا مراد ہے، حالی۔ ص ۱۳۱

۸۔ مقدمہ شعروشاعری، جوش سے کیا مراد ہے، حالی۔ ص ۱۳۵

۹۔ مقدمہ شعروشاعری۔ عبرانی اور عربی شاعری میں سب سے زیادہ جوش تھا، حالی۔ ص ۱۳۶

۱۰۔ مقالات شبلی، جلد دوم، فن بلاغت۔ ص ۲۴

۱۱۔ مقالات شبلی، جلد دوم، فن بلاغت۔ ص ۲۵

۱۲۔ نئی نسلیں، ماہنامہ ادب اور لطیف کی غائیت، ستمبر ۱۹۵۵ء۔ بحوالہ ادب کا اسلامی تناظر۔ ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی۔ ص ۳۰، ۳۱

■■ اہل نظر اور کیفی اعظمی

مطالعے کے دوران کیفی کی شاعری کے متعلق مشاہرین ادب کی تنقیدی آرا بھی میرے سامنے آئیں، جو کافی اہم ہیں۔ جس سے ان کی شاعری کے رنگ و آہنگ کا پتہ چلتا ہے لہٰذا نہایت اختصار میں ان کا محاکمہ بھی ضروری سمجھتا ہوں۔

کیفی اپنے گردوپیش کے ماحول سے کبھی بے خبر نہیں رہے۔ ان کی پوری شاعری اپنے عہد کے حادثات و واقعات کی ترجمان ہے، جس کا بہت بلیغ اظہار ان کی شاعری میں ہوا ہے۔ وہ بہت صاف گوئی سے اپنی بات عوام کے سامنے رکھ دیتے ہیں، جہاں ان کا حساس نظریۂ حیات اپنی پوری دردمندی کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے اور اس دردمندی میں محنت کش مزدور اور استحصال زدہ عوام کا دکھ بولتا ہے۔ کیفی مایوسیوں اور اندھیروں کے شاعر نہیں، ان کے یہاں زندگی کے تاریک سے تاریک پہلو بھی اتنے روشن اور تابناک معلوم ہوتے ہیں کہ ہمیں زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی سر کرنے کا حوصلہ فراہم کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کی پوری شاعری زندگی کا ایک محاسبہ بھی ہے اور عظیم مجاہدہ بھی، اور اس عظیم مجاہدے میں ان کے عزائم، ان کی قوت اور ان کے افکار نہ صرف کارزار حیات کی منزلوں کو عبور کرتے ہیں بلکہ فتح مندی کی نوید بھی دیتے ہیں۔

ان کے یہاں زندگی کی فرسودہ روایت سے بغاوت اور غیر طبقاتی نظام کے حوالے سے جو احتجاج سامنے آتا ہے، وہ یونہی نہیں ہوتا۔ ان کی چیخ یا احتجاج کسی دیوانے یا عام آدمی کی کوئی ہذیانی کیفیت نہیں ہے، بلکہ علم و عمل کے پیغام سے ان کی چیخ مہمیز ہوتی ہے۔ ان کا احتجاج وقت کے تقاضوں کو بروقت پورا کرنے کا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تحریک کے کرب کو اور عوامی استحصال کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور سمجھا ہے۔ کیفی کے یہاں انقلابی تصور کیا ہے؟ وہ انقلاب آیا یا نہیں۔ اس سلسلے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی، ہاں اتنی بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ وہ انقلابی شاعری کی مشعل لئے موجودہ نسل کی ہی نہیں بلکہ آنے والی نسل کی بھی رہنمائی کرنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہیں، کیونکہ ان کی نگاہ ماضی، حال کے ساتھ مستقبل پر بھی ہے۔ نہ وہ ذات سے بے خبر ہیں نہ کائنات سے۔

ان کی شاعری ذات و کائنات کے روشن امکانات سے لبریز ہے' جہاں عزم و استقلال' فکری توانائی' الفاظ کا بانکپن اور رعنائی خیال یہ تمام چیزیں ایک نئی سج دھج کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔ جو نہ صرف ان کے فلسفۂ حیات کو سامنے لاتی ہیں' بلکہ ان کی جمالیاتی حس اور شعری شعور کو بھی زندگی کی ایک علامت بنا دیتی ہیں اور یہی علامت زندگی کے فکر و احساس کو بیدار کرنے میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔

کیفی کی شاعری تھوڑے فرق کے ساتھ ایک صدی کا مطالعہ ہے۔ اس طویل مدت میں انہوں نے جو کچھ دیکھا ہے' بھوگا ہے اور محسوس کیا ہے' اسے بڑی ذمہ داری کے ساتھ اپنی شاعری میں برتا بھی ہے۔ ان کے ضمیر کی شعری سچائیاں انہیں مصلحت پسندی' دباؤ اور بے جا تکلف سے روکتی ہیں۔ وہ کبھی متعصبانہ سماج سے سمجھوتہ نہیں کرتے اور نہ ہی فن کے تقاضوں پر مقصد کو قربان کرتے ہیں۔ ان کے سامنے تو زندگی کا ایک تصور ہوتا ہے اور اس تصور سے ان کا کمٹمنٹ ہی ان کی شاعری کو معتبر بنا دیتا ہے۔ ان کی شاعری' عالم گیر حقائق کی تلاش میں ان کے ذہن و شعور کو مقامی یا ذاتی سطح تک محدود نہیں رکھتی' بلکہ قید و بند سے آزاد کرتے ہوئے خود کو آفاقیت کے قریب کر دیتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی آواز ذات و کائنات کی' عزم و یقین کی اور حرکت و عمل کی شاعری بن جاتی ہے۔

المختصر آپ دیکھیں گے کہ مشاہیر کی آرا کی روشنی میں میری بحث و تمحیص کی صداقت بھی سامنے آجائے گی اور ان کی شاعری سے متعلق ذہن میں اٹھنے والے کچھ اہم سوالات کے جوابات بھی آپ کو مل جائیں گے مثلاً:

- معاصر شعراء میں ان کی انفرادیت کیا ہے اور کن اوصاف میں وہ جدا ہیں؟
- ان کی شاعری سے جو شعری کردار ابھرتا ہے اس کی پہچان کے عناصر کیا ہیں؟
- ان کی شاعری کا مرکزی موضوع' معاملہ اور سروکار کیا ہیں؟
- اظہار و بیان کے باب میں ان کے نمایاں شاعرانہ اطوار کیا ہیں؟
- ان کی شاعری کی نوعیت کیا ہے؟

فیض : "جیسی سفاک اور بے رحم زندگی ہمارے گردوپیش موجود ہے اسی کی بے کم و کاست منظر کشی کیفی کا مسلک شعر ہے۔ نہ تلخی زبان سے گھبراتے ہیں' نہ تلخی کلام سے گریز کرتے ہیں' نہ زہر کو قند بناکر پیش کرنے کے قائل ہیں نہ قند کی حقیقت سے انکاری اور اس کے باوجود کیفی کی شاعری زہر اور قند کا ملغوبہ نہیں ہے بلکہ ایک ٹھہرے ہوئے

دردمند فکر انگیز اور حساس نظریۂ حیات و فن کا بلیغ اظہار ہے جس میں کوئی جھول اور کوئی تضاد مشکل ہی سے دکھائی دے گا۔"

"غنائیہ شاعری کی سطحی تکلفات اور معنوی زیبائشوں سے کیفی نے کم سروکار رکھا ہے۔"

سجاد ظہیر : "کیفی کی شاعری قدیم و جدید دونوں قسم کی ادبی غلاظتوں سے پاک ہے۔ اس میں سچی ترقی پسندی کی جھلک نظر آتی ہے اس کا خیال ونصب العین صاف و متعین' اس کا طرز بیان سیدھا اور براہ راست' اس کی تشبیہیں و استعارے نئے اور دلکش ہیں۔"

خلیل الرحمٰن اعظمی : "کیفی اعظمی ایک شاعرانہ شخصیت لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ مخدوم کی طرح ان کی ابتدائی نظمیں بھی لطیف کیفیتوں اور دل کی دھڑکنوں سے معمور ہیں اور ان میں ادائے بیان کی ایک اپج بھی ہے۔"

سہیل عظیم آبادی : "وہ ان چند شاعروں میں ہیں جن کی فنکاری کا مطالعہ کرکے دل کے تاروں میں لرزش پیدا ہونے لگتی ہے۔ ایک عجیب سی تھرتھراہٹ اور ایک عجیب سی کیفیت کا احساس جاگ اٹھتا ہے اور جس کیفیت کے بیان میں الفاظ اپنا ایمان کھو بیٹھتے ہیں۔"

علی سردار جعفری : "کیفی اردو شاعری کے باغ میں سرخ گلاب ہیں۔"

"آج کیفی اعظمی کو برصغیر کا ممتاز ترقی پسند شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ ایک بے حد آرٹسٹک خاندان کے سربراہ ہیں۔"

محمد حسن : "آج کیفی کی شاعری ایک ایسے حساس فرد کی

شاعری ہے جو حکیمانہ شعور کو پورے طور پر اپنا کر مایوسیوں کے اندھیروں میں بھی زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی ہمت اور جرأت رکھتا ہے اور اپنی شخصیت اور شاعری کو انسان کے اس عظیم مجاھدے کا حصہ جانتا ہے جو ازل سے جاری ہے اور رہتی دنیا تک جاری رہے گی اور جس کے نتیجے کے طور پر تہذیب و تمدن کی ساری برکتیں' زبان اور شعر کی ساری لطافتیں اور علم و عمل کے سارے تاج محل' ایسے انسانیت کو حاصل ہوئے ہیں۔ کیفی اس مجاھدے کے سپاھی بھی ہیں اور مغنی بھی۔"

کرشن چندر : "کیفی کے لہجے میں گھن گرج ہے جو چٹان کے سینے کو بھی لرزا دے۔"

قمر رئیس : "کیفی ترقی پسند شعراء کے اس حلقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو زندگی کے ہر دور میں محنت کش عوام اور ان کی تحریکوں سے جڑے رہے جو انصاف اور آزادی کے لئے محکوم اور مظلوم انسانوں کی جدوجہد "ان کے عزائم" ان کی قوت اور ان کی آخری فتح پر ایمان اور عقیدہ رکھتے ہیں۔"

محمد علی صدیقی : "کیفی اعظمی ترقی پسند تحریک کے اہم نام ہیں۔ اگر فیض احمد فیض کی رومانیت عالمی ادب کی سربرآوردہ خوشبوں سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی روایت میں زندہ ہے۔ اگر مخدوم روایت اور بغاوت کا حسین امتزاج ہیں۔ اگر سردار کی تعقل پسندی کے ڈانڈے مشرقی و مغربی افکار کے سوتوں سے جا ملتے ہیں اور نغمگی و بلند آہنگی کی ایک مثال ہیں۔ اگر قاسمی کے یہاں انقلابی شاعری کا نصب العین جدت پسندی سے متصادم نہیں ہے تو کیفی

اعظمی کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کے یہاں رومان' کشمکش حیات اور انقلاب ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے کار زار حیات کی منزلوں کو سر کرتے ہوئے ملتے ہیں۔"

جوگندر پال : "کیفی اعظمی کی وارداتیں اس کی کھلی کھلی آنکھوں کی دین ہیں۔ گرد و پیش اس کی نظر میں اکڑ پیدا کرنے کی بجائے بھتا چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری پر سجے دھجے جھوٹ کا گمان نہیں ہوتا بلکہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ سچائیاں جھیل جھیل کر لکھتا ہے۔"

ش۔ اختر : "اردو کے ترقی پسند شعراء میں بھتوں نے کچھ دور چل کر اپنے لئے نئی پناہ گاہیں تراش لیں کچھ لوگوں نے اسلامیات کا سہارا لیا' کچھ نے جدیدیت کی توسیع میں ہاتھ بٹایا' کچھ تھک ہار کر خاموش ہو رہے لیکن کیفی نے تحریک کے کرب کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔"

شارب ردولوی : "کیفی کا احتجاج وقت کے تقاضوں کا احتجاج ہے۔ ایک مقصد کے لئے احتجاج ہے اگر وہ اس وقت کے تقاضے اور اس مقصد کو پورا کرنے کا ہے تو وہ کامیاب شاعر ہیں۔ انہوں نے جو کچھ لکھا وہ یہ سوچ کر نہیں لکھا کہ وہ فن کی تخلیق کر رہے ہیں۔ ان کے سامنے تو وہ حالات تھے جس پر ان کا قلم چیخ پڑتا تھا۔"

راج بہادر گوڑ : "کیفی اردو کی انقلابی شاعری کی مشعل لئے ہوئے ترقی پسندوں کے روز افزوں کارواں میں آگے چلنے والی حقیقت ہیں۔"

جگن ناتھ آزاد : "کیفی کی شاعری کسی ایک فارمولے کی پابند

تیار ہو کر لگ بھگ ایک گھنٹہ دیر سے اسٹیشن پہنچا۔ آدھا گھنٹہ ٹرین بھی اپنے وقت سے لیٹ تھی۔ دیکھتا ہوں کہ تمام لوگ ٹرین کے انتظار میں کھڑے ہیں اور اسٹیشن ماسٹر کے ساتھ کئی اسٹاف بھی میرے انتظار میں کھڑے ہیں۔ کچھ مسافروں کو یہ معلوم بھی ہو گیا تھا' مگر کیفی صاحب کے مہمان کا معاملہ تھا' اس لئے سب خاموش تھے۔ اسٹیشن ماسٹر نے اپنے اسٹاف سے کہا کہ سگنل دے دو' تھوڑی دیر میں ٹرین اسٹیشن پر لگ گئی۔ پھر اسٹیشن کا پورا عاملہ ساتھ آ کر مجھے سیٹ پر بٹھایا' میں نے ٹکٹ کے لئے پیسے نکالے' تو ٹکٹ میرے ہاتھ میں تھما دی اور کہا کہ آپ میرے بھی مہمان ہیں۔

وہاں سے لوٹنے کے بعد کبھی کبھی فون پر ان سے باتیں ہو جاتی تھیں۔ میں نے اپنی کتاب کمپوز کروالیا تھا' پروف کرنا باقی تھا' معلوم ہوا کہ وہ سخت بیمار ہیں اور جسلوک اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ کچھ دن قبل ہی ان کا ایک آپریشن ہوا تھا' اس وقت ان سے فون پر بات بھی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں اس بار کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ شاید وہ بچ نہیں پائیں گے۔ مجروح اور سردار جعفری کی موت کا صدمہ ان کے لئے ناقابل برداشت تھا' پھر ایسے حساس آدمی کے لئے گجرات کا شرمناک واقعہ بھی کچھ کم جان لیوا نہیں تھا۔ اسی ڈر سے میں نے اسی کمپوز میٹر کو کتاب کی شکل میں بغیر پروف کئے انہیں بھیج دیا کہ کم از کم وہ اس کتاب کو ایک نظر دیکھ تو لیں۔ میں ہر دو تین دن پر فون سے بات کرتا اور ان کی خیریت پوچھتا۔ ریتا نام کی ایک لڑکی ان کی خیریت بتاتی۔ میں ہر روز ریتا کو یہ تاکید کرتا کہ جب وہ کچھ ٹھیک ہو جائیں' تبھی انہیں یہ کتاب دکھائیں' تاکہ انہیں کتاب کی وجہ سے کوئی تکلیف نہ ہو' مگر ہر روز ان کی طبیعت بگڑتی رہی اور وہ ہر پل موت سے قریب ہوتے رہے۔ ایک نامکمل خواہش کتاب کی شکل میں وہاں پڑی رہی۔ لیکن مجھے ہر پل' یہ احساس کچوکے لگاتا رہا کہ 'کوئی دیتا ہے درد دل پہ مسلسل آواز'۔

پھر ان کی موت کی خبر نے مجھے اس لائق ہی نہیں چھوڑا کہ کچھ کر سکوں' میں خود سے بددل تھا کہ میں ان کی خواہش بروقت پوری نہ کر سکا' میں نے سب کچھ ویسا ہی چھوڑ دیا' سال گزر گیا' لیکن اب یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے اور اپنا حق مانگتی ہے۔

میں اپنی صلاحیتوں سے واقف' ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم بھلا کتاب سے متعلق کیا دعویٰ کر سکتا ہوں' میں اپنی حدیں جانتا ہوں اس لئے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوں۔ میں نے جو محسوس کیا' اسے لکھا' اب آپ مجھے جانبدار کہیں یا غیر جانبدار' مرضی آپ کی' لیکن میری مرضی کا تقاضا تو یہ تھا کہ ادب کو کھلی فضا میں سمجھوں اور تخلیق کا تجزیہ اسی حوالے سے پیش کروں' جو اس کا مزاج تھا۔

کیفی کو میر اور غالب کی کسوٹی پر دیکھنا یہ میرے بس کی بات تھی بھی نہیں اس لئے انہیں اسی تنقید کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے' جو ان کی تخلیق کو درکار تھی تاکہ کیفی کو (ترقی پسند) کیفی کے

نہیں ہے۔ اس کی نگاہ ماضی پر بھی ہے حال پر بھی اور مستقبل پر بھی۔ غم جاناں بھی اس کا موضوع ہے' غم ذات بھی اور غم دوراں بھی۔ اس کی شاعری انسان کے امکانات سے لبریز ہے اور انسان کی ان مجبوریوں کے ذکر سے بھی جو خود انسان نے انسان کے لئے پیدا کی ہیں۔"

اصغر علی انجینئر : "ان کی یہ شاعری فیوڈل ماحول کی غماز ہیں اور جاگیردار طبقے کی (Pleasure principle) کی عکاسی کرتی ہے۔ ان کی اس قبیل کی شاعری میں الفاظ کا بانکپن' رعنائی خیال اور وفور جذب و شوق سبھی کچھ مل جاتا ہے اورکسی بھی شاعر کا ادب میں مقام پیدا کرنے کے لئے یہ صفات کم نہیں ہیں۔"

انور سدید : "کیفی اعظمی ایک ایسی تہذیب کے زائیدہ ہیں جو جسم اور زمین کے تقاضوں کو اہم تصور کرتی ہے اور عشق و محبت جس کی نمو اور فروغ کا وسیلہ ہے' یہ شاعری ہندوستان کے ایک خاکی انسان کی شاعری ہے۔ اس لئے اس میں لئے کا جادو اپنا اثر و عمل خوبی اور خوبصورتی سے جگاتا ہے اور شاعر کو افلاطون بننے سے بچا لیتا ہے۔"

مظفر حنفی : "نرم و سبک الفاظ' جگر جگر کرتی ہوئی تشبیہات و استعارات اور خوشگوار صوتی آہنگ رکھنے والی تراکیب استعمال کرنے کا جیسا سلیقہ کیفی اعظمی کو آتا ہے ان کے معاصرین میں فیض اور مخدوم کے علاوہ بہت کم کے حصے میں آیا ہے۔"

"عام طور پر رومانی شاعروں کے بیان عاشق کی قلبی کیفیات کے مرقعے تو نظر آتے ہیں لیکن محبوب کی واردات قلب اور

نفسیاتی پہلو کو بہت کم شعرا نے موضوع شعر بنایا ہے۔ اس ضمن میں کیفی اعظمی کی بہت سی نظمیں انہیں معاصرین سے ممتاز بناتی ہیں۔"

عتیق اللہ : "کیفی نے جمالیات کے مروج فلسفیانہ نظریات کے برخلاف زندگی اور فن کو ایک ہی فعال حقیقت کا نام دیا ہے اور لمحے لمحے کی اذیتوں اور جسارتوں کو اس طور پر رقم کرتے رہے ہیں کہ ان کی تمام شرکتیں محفوظ و معتبر ہوگئیں۔"

آغا رشید مرزا : "کیفی گھات کا پتھر ہے۔ وقت کی تندوتیز موجیں اس سے ٹکراتی ہیں اور واپس ہو جاتی ہیں' وہ انہیں اپنا احساس دے دیتا ہے اور زندگی کے بحربیکراں میں پھر واپس کر دیتا ہے۔"

سید حامد حسین : "کیفی اعظمی نے فنی کمال کے اس جوہر کو دریافت کر لیا ہے کہ کس طرح فنکار کا تخلیقی شعور عالمی تجربے کی علامتوں سے ایک پورے نظام فکر و احساس کے لئے ایک علامت عظمیٰ کی تعمیر کر سکتا ہے۔"

زرینہ ثانی : "کیفی اعظمی نے اندھیروں میں شمعیں جلائیں' مایوسی میں رجائیت کا دامن نہیں چھوڑا' کرب و الم میں بھی کہیں نہ کہیں سے کوئی چمکیلی شفاف کرن ضرورنظر آجاتی ہے۔ دردمندی دل سوزی ان کی خصوصیت ہے' یہی درد مندی اور خلوص ان کی مستقبل کی درخشنداں کی ضمانت ہے۔"

افصح ظفر : "اہمال سے معنویت پیدا کرنے کا فن کیفی کو طنز کے آرٹ کے تخلیقی جوش سے نصیب ہوا ہے اور مجھے یہ

محسوس ہوتا ہے کہ کیفی اس رنگ میں بہت کچھ تخلیق کر سکتے ہیں۔"

سہیل احمد خاں : "میں نے جب بھی کیفی اعظمی کو پڑھا تو مجھے ان کی شاعری میں جمالیات کے ساتھ خالص "سماجی شعور" نظر آیا' جو آج کے ماحول کا لہو ہے۔ گذرے ہوئے برسوں کا ہر لمحہ کیفی کو ازبر یاد ہے' اس کی وارداتیں' ناانصافیاں' محرومیاں سب کچھ۔"

عبدالقوی دسنوی : "کیفی بھائی حال میں گم ہو کر ماضی سے بے تعلق ہونا نہیں چاہتے۔ ماضی کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں وہ زندگی سے محبت کرتے ہیں' انسان سے محبت کرتے ہیں اور انسان ماضی بھی ہے' حال بھی' مستقبل بھی۔"

اختر راہی : "اب وہ اس عہد کے نقادوں کے لئے عظیم ہوں یا نہ ہوں۔ آنے والا دور جب اردو ادب کی تاریخ مرتب کرے گا تو وہ تاریخ کیفی صاحب کے ذکر کے بنا مکمل نہ ہو سکے گی۔"

نامی انصاری : "ان کی جدید ترین نظموں میں فکر کی صلاحیت اور پختگی برابر نمایاں ہوتی جا رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ کیفی نے بڑی اور حقیقی شاعری کے اسرار و رموز کو پا لیا ہے۔"

فتیل شفائی : "جسمانی توانائی کم ہوتے ہوئے بھی کیفی صاحب کی یہ جہاں گردی ان کی توانا محبتوں کا ہی ثمرہ معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ اعصاب پر تعصبات کا بوجھ رکھے ہوئے اور ذہنوں میں تنگ نظری کی غلاظت بھرے ہوئے لوگوں کے لئے کیفی صاحب کی یہ فعال زندگی حیرت کا باعث ہے۔"

بھیشم ساھنی : "اس طویل مدت میں کیفی کی شاعری نے ایک نئی بلندی کو چھوا ھے۔ شاعری جو اس وقت ایک بستی کے مزدوروں کی علامت تھی' آج وہ ھمارے ملک کے لاکھوں محنت کش لوگوں کی علامت ھے۔"

شاھد ماھلی : "کیفی اعظمی اپنے ضمیراور فن کے تئیں ایمانداری اور خلوص کا رویہ اختیار کرکے اپنی رنگارنگ عظیم تھذیب متعصبانہ سیاست کا شکار ھوتی ھوئی اپنی مظلوم لیکن زندہ و پائندہ زبان اور اس کے شعر و ادب کی قابل قدر روایات اور اپنے عھد کے انسان کی آواز بن گئے۔"

ڈاکٹر مغنی تبسم : "کیفی نے قول متناقص (Paradox) کو ابتداء ھی سے اپنا ایک پیرایۂ اظھار بنایا ھے اور اس سے کھیں طنزیہ نگاری اورکھیں ملی جلی متضاد کیفیات کی پیکر تراشی کا کام لیا ھے۔ اس پیرایۂ اظھار کا نمونہ وہ وصفی مرکبات ھیں جو کیفی نے اختراع کئے ھیں۔

ساگر سرحدی : "آج جب ھر عقیدہ بکھر چکا ھے' ھر قدر سے انکارھے' لوگ اکائیوں میں بٹ گئے ھیں' ایک لاتعلقی کا احساس ھے اس میں کچھ سیاسی حالات کا ھاتھ ھے اور کچھ باشعور طبقے کا کمٹ منٹ سے انکار اور اس سے پیدا ھونے والے خطرات سے دامن بچانے کا خیال ھے۔ وہ چاھے کچھ بھی ھو' لیکن ایسے حالات میں ایک شخص اپنے انداز میں' مقدور بھر کوششیں کر رھا ھے کہ جوخواب اس نے جوانی میں دیکھا تھا اور جس کی تکمیل میں وہ زندگی بھر سر گرداں رھا' آج بھی اس کی حسین تعبیر ڈھونڈتا رھے اور مزے کی بات یہ ھے کہ اپنے ساتھیوں میں اکیلا وھی اجتماعی طورپر برسر پیکار ھے۔"

ساغر خیامی : "میری رائے میں کیفی اعظمی بڑے شاعر ہیں اگر ان کی شخصیت کو مرکز بنا کر کوئی دائرہ بنایا جائے تو وہ تنگ ہو جاتا ہے۔ اگر ان کے فن پر گفتگو کی جائے تو الفاظ گونگے ہو جاتے ہیں۔ ان کے قد کے سامنے ہر اعزاز بونا ہو جاتا ہے۔ انہوں نے بھی عمر بھر وہی کیا جو میر کا وطیرہ رہا یعنی شعر خواص کے لئے کہے گفتگو عوام سے کی۔"

ساغر اعظمی : "کیفی اعظمی صاحب تنہا شخص کا نام نہیں ہے بلکہ ایک محفل کا نام ہے۔"

رضوان احمد : "کیفی اعظمی کی شخصیت اور شاعری باہم اس قدر مربوط ہے کہ دونوں کو الگ کرکے نہیں دیکھا جا سکتا۔ شاید اس لئے کہ انھوں نے وہی کہا جو دیکھا ہوگا اور جھیلا ہوگا۔ وہی رقم کیا جو ان کے دل پر گذری' اسی کا اظہار کیا جو ان کے ذہن و دل نے محسوس کیا' اس سے بے پرواہ کہ یہ شاعری آفاقی بن سکے گی یا نہیں ماورائے بھرکھلائے گی یا نہیں۔"

خلش جعفری : "ان کی شاعری کا سارا سہاناپن بھی اسی شئی اور دھرتی کی دین ہے۔ جس سے علم وتہذیب کی تمام شاخیں پھوٹی ہیں اور فنون لطیفہ کی ساری اصناف نے جنم لیا ہے۔"

ڈاکٹر شمیم رضوی : "بعض اوقات کیفی اعظمی پر خطابت کا الزام لگایا جاتاہے۔یہ الزام درست ہے۔ اسی خطابت کے بل بوتے پرانھوں نے لاکھوں محنت کشوں کے ذہنوں میں ادب اور زندگی کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ کرنے والی دیوار کو پاش پاش کیا ہے۔

شاعر جمالی : "انہیں جو کہنا ہوتا ہے کہہ دیتے ہیں۔ نہ مصلحت نہ دباؤ نہ تکلف نہ خواہ مخواہ کا رکھ رکھاؤ یہ بے خوف گفتگو اندر کے آدمی کا پتہ دیتی ہے جو سب کچھ ہو سکتا ہے مگر منافق نہیں ہو سکتا۔"

اسلم کولسری : "کیفی صاحب کی شاعری ٹھیک سے نہیں پڑھی لیکن اس کے باوجود ہم نے ان کے نغموں کو کانوں میں رس گھولتے نظموں کو ذہن میں سلگتے اور غزلوں کو دل پہ برستے ہوئے باقاعدہ محسوس کیا ہے۔"

قمر جمیل : "کیفی اعظمی کی شاعری اس مقصدیت کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص اسلوب اور مزاج رکھتی ہے یہ شاعری نازک بھی ہے اور اس میں لفظوں کو استعمال کرنے کا ایک سلیقہ بھی ہے جو ہماری پوری روایت سے جڑا ہوا ہے۔"

اختر الاسلام : "کیفی نے ہمیشہ عالم گیر حقائق کااتباع کیا زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھا اور اپنے ذہن و شعور کو مقامی ذاتی سطح تک محدود نہیں رکھا۔"

خلیل الرب : "کیفی کی شاعری عزم و یقین اور حرکت و عمل کی شاعری ہے۔ اعتماد اور حوصلہ مندی کی شاعری ہے۔ سوز یقیں سے غلاموں کے لہو کو گرمانے کی شاعری ہے۔ یہ عداوت و نفرت کی آگ کو بجھانے اور زخم خوردہ دلوں پر اخوت و محبت کا مرہم لگانے کی شاعری ہے۔ اس شاعری پر آفاقی احساس درد کا پرتو ہے یہ ہرخطہ ارض اور ہر دورمیں انسانی حقوق و اقدار کی پامالی کے خلاف احتجاج کی شاعری ہے۔"

حفیظ باحلیم : "اگر ہم کیفی کی شاعری کو اردو شاعری کی

روح افکار کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ ان کے یہاں تاج شاہی اور تخوت خسروانہ کے خلاف شدید ردعمل ملتا ہے اور یہی ان کی شاعری کی پہچان ہے۔"

پیرزادہ قاسم : "کیفی اعظمی کا نام ہمارے عہدکے منظرنامے پر ممتاز اور جلی حروف میں ثبت ہے۔ شاعری اور زندگی یا زندگی اور شاعری سے فکری اور عملی وفاکشی نے ہی انہیں یہ تابندگی عطا کی ہے۔ ان کی زندگی اور شاعری ایک دوسرے کا جواز ہیں اور ان کا حرف سخن حرف معتبر مانا جاتا ہے۔"

اقبال سعود : "کیفی اعظمی کی شاعری تو روشنی کی دن کی اور جلتے سورج کی شاعری ہے۔"

راز الہٰ آبادی : "ان کی شاعری کائنات کی ناہمواریوں کو آئینہ دکھاتی ہے۔"

■■

ضمیمہ

- کیفی کی منتخب نظمیں
- نامے میرے نام
- تصویریں

دعوت

کوئی دیتا ہے درِ دل پہ مسلسل آواز
اور پھر اپنی ہی آواز سے گھبراتا ہے
اپنے بدلے ہوئے انداز کا احساس نہیں
میرے بہکے ہوئے انداز سے گھبراتا ہے

ساز اٹھایا ہے کہ موسم کا تقاضا تھا یہی
کانپتا ہاتھ مگر ساز سے گھبراتا ہے
راز کو ہے کسی ہم راز کی مدت سے تلاش
اورؔ دلِ صحبت ہم راز سے گھبراتا ہے

شوق یہ ہے کہ اڑے وہ تو زمیں ساتھ اڑے
حوصلہ یہ ہے کہ پرواز سے گھبراتا ہے
تیری تقدیر میں آسائشِ انجام نہیں
اے کہ تو شورشِ آغاز سے گھبراتا ہے

کبھی آگے کبھی پیچھے کوئی رفتار ہے یہ
ہم کو رفتار کا آہنگ بدلنا ہوگا
ذہن کے واسطے سانچے تو نہ ڈھالے گی حیات
ذہن کو آپ ہی ہر سانچے میں ڈھلنا ہوگا

یہ بھی جلنا کوئی جلنا ہے کہ شعلہ نہ دھواں
اب جلا دیں گے زمانے کو جو جلنا ہوگا

راستے گھوم کے سب جاتے ہیں منزل کی طرف
ہم کسی رخ سے چلیں ساتھ ہی چلنا ہوگا

■

نیا حسن

کتنی رنگیں ہے فضا کتنی حسیں ہے دنیا
کتنا سرشار ہے ذوقِ چمن آرائی آج
اس سلیقے سے سجائی گئی بزمِ گیتی
تو بھی دیوارِ اجنتا سے اتر آئی آج

رونمائی کی یہ ساعت، یہ تہی دستیٔ شوق
نہ چرا سکتا ہوں آنکھیں نہ ملا سکتا ہوں
پیار سوغات، وفا نذر، محبت تحفہ
یہی دولت ترے قدموں پہ لٹا سکتا ہوں

کب سے تخیل میں لرزاں تھا یہ نازک پیکر
کب سے خوابوں میں مچلتی تھی جوانی تیری
میرے افسانے کا عنوان بنی جاتی ہے
ڈھل کے سانچے میں حقیقت کے، کہانی تیری

مرحلے جھیل کے نکھرا ہے مذاقِ تخلیق
سعیٔ پیہم نے دیئے ہیں یہ خدوخال تجھے
زندگی چلتی رہی کانٹوں پہ انگاروں پر
جب ملی اتنی حسیں، اتنی سبک چال تجھے

تیری قامت میں ہے انساں کی بلندی کا وقار
دخترِ شہر ہے، تہذیب کا شہکار ہے تو

حوالے سے ہی سامنے لایا جا سکے۔ اس میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں' کہہ نہیں سکتا' ہاں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ کتاب میں جو کمی اور خامی ہے وہ میری اپنی ہے' جو آپ کے مشورے سے دور ہو سکے گی۔

آخر میں یہ رسم بھی ادا کرتے ہوئے اپنی ممونیت کا اظہار کرتا چلوں کہ میں اپنی شریک حیات رضیہ سلطانہ اور ان تمام دوست احباب کے علاوہ اپنے نگراں جناب ش اختر کا بے حد مشکور ہوں' جنہوں نے اخلاص کے ساتھ میری معاونت فرمائی۔ شکریہ

لکچرار' ڈی ایس کالج' کٹیہار

اب نہ جھپکے گی پلک، اب نہ ہٹیں گی نظریں
حسن کا میرے لئے آخری معیار ہے تو

یہ تیرا پیکرِ سیمیں، یہ گلابی ساری
دستِ محنت نے شفق بُن کے اڑھادی تجھ کو
جس سے محروم ہے فطرت کا جمالِ رنگیں
تربیت نے وہ لطافت بھی سکھا دی تجھ کو

آگہی نے تیری باتوں میں کھلائیں کلیاں
علم نے شکّریں لہجے میں نچوڑے انگور
دل ربائی کا یہ انداز کسے آتا تھا
تو ہے جس سانس میں نزدیک اسی سانس میں دور

یہ لطافت، یہ نزاکت، یہ ادا، یہ شوخی
سو دیئے جلتے ہیں اندھی ہوئی ظلمت کے خلاف
لبِ شاداب پہ چھلکتی ہوئی گلنار ہنسی
اک بغاوت ہے یہ آئینِ جرأت کے خلاف

حوصلے جاگ اٹھے سوزِ یقیں جاگ اٹھا
نگہہِ ناز کے بے نام اشاروں کو سلام
تو جہاں رہتی ہے اس ارضِ حسیں پر سجدہ
جن میں تو چلتی ہے ان راہگذاروں کو سلام

آ قریب آ کہ یہ جوڑا میں پریشاں کر دوں
تشنہ کامی کو گھٹاؤں کا پیام آجائے
جس کے ماتھے سے ابھرتی ہیں ہزاروں صبحیں
میری دنیا میں بھی ایسی کوئی شام آجائے

■

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

ایک بوسہ

جب بھی چوم لیتا ہوں ان حسین آنکھوں کو
سو چراغ اندھیرے میں جھلملانے لگتے ہیں

پھول کیا، شگوفے کیا، چاند کیا، ستارے کیا
سب رقیب قدموں پر سر جھکانے لگتے ہیں

رقص کرنے لگتی ہیں مورتیں اجنتا کی
مدتوں کے لب بستہ غار گانے لگتے ہیں

پھول کھلنے لگتے ہیں اجڑے اجڑے گلشن میں
پیاسی پیاسی دھرتی پر ابر چھانے لگتے ہیں

لمحے بھر کو یہ دنیا ظلم چھوڑ دیتی ہے
لمحے بھر کو سب پتھر مسکرانے لگتے ہیں

■

تلنگانہ

ضعیف مائیں، جوان بہنیں، جھکے ہوئے سر اٹھا رہی ہیں
سلگتی نظروں کی آنچ میں بھیگی بھیگی پلکیں سکھا رہی ہیں
لہو بھری چولیوں، پھٹے آنچلوں سے پرچم بنا رہی ہیں
ترانۂ جنگ گا رہی ہیں

ذرا پکار دو بے چین نوجوانوں کو
ذرا جھنجھوڑ دو کچلے ہوئے کسانوں کو
ادھر سے قافلۂ انقلاب گذرے گا
بچھا دو سینۂ گیتی پہ آسمانوں کو

سفید پلکوں، کھنچی ہوئی جھریوں میں شعلے مچل پڑے ہیں
جواں نگاہوں، جواں دلوں سے، ہزار طوفاں ابل پڑے ہیں
بھرے ہوئے دامنوں میں پتھر، گھروں سے بچے نکل پڑے ہیں
سب ایک ہی سمت چل پڑے ہیں

بتا دو قصر حکومت کی سب مکینوں کو
بچا سکیں تو بچالیں گے شہہ نشینوں کو
ترستے رہتے ہیں جو ہاتھ آستیں کے لئے
جلال میں وہ الٹ دیتے ہیں زمینوں کو

چمک رہے ہیں، گھٹیلے شانوں پہ پھاوڑے، بیلچے، کدالیں
اڑا رہی ہیں ہوا میں چنگاریاں تفنگوں کی گرم نالیں
وہ گولیاں بے جھجک لہو میں جو بادشاہوں کے بھی نہا لیں
وہ گو پھنیں تاج جو گرالیں

یہ جست روس کے میدان نے سکھائی ہے
یہ فوج چین سے ہوتی دکھن میں آئی ہے

وہ اٹھ کھڑے ہوئے دھرنا دیئے جو بیٹھے تھے
کہ آج شاہ کے ایوان پر چڑھائی ہے

یہ شہر یاری، یہ تاج داری، وجود پر بار ہوگئی ہے
جفا کی خوگر غریب دنیا جفا سے بیزار ہو گئی ہے
زمین ہر چھاؤنی نگلنے پر آج تیار ہو گئی ہے
کہ بھوک بیدار ہوگئی ہے

نہ صرفِ خاص کی حد بندیاں نہ جاگیریں
ہر ایک گام پر ٹوٹی پڑی ہیں زنجیریں
وہ کھیت کون اجاڑے گا کون لوٹے گا
اُگی ہوئی ہیں منڈیروں پر جن کی شمشیریں

عوام کا اضطراب ہے یہ، عوام کا پیچ و تاب ہے یہ
ستم سے دبنا ہے غیر ممکن کہ ہر ستم کا جواب ہے یہ
سمجھتے ہو ستیہ گرہ اس کو، زندگی کا عتاب ہے یہ
جھکا دوسرا انقلاب ہے یہ

کہاں جہاد، کہاں جدوجہد کی منزل
مفاہمت نہیں پاتی جہاد کا حاصل
ہوائے ثند نے گوندھی ہے زلفِ آزادی
بغاوتوں نے نکھارا ہے حسنِ مستقبل

حیات انگڑائی لے کے اپنا نظام اب خود سنبھالتی ہے
جلی ہوئی بستیوں پہ تعمیر عکس شہروں کا ڈالتی ہے
روش روش کو شگوفہ کاری چمن کے سانچے میں ڈھالتی ہے
کلی کلی رنگ اچھالتی ہے

لہو سے سینۂ گیتی کے داغ دھوئے ہیں
جگا کے خاک کی قسمت شہید سوئے ہیں
کہیں کی فوج سہی، اس طرف کا رخ نہ کرے
یہاں زمین میں بم من چلوں نے بوئے ہیں

ابھرتی انسانیت کی توہین ہے تشدد کی حکمرانی
جبین تاریخ پر ہے اک داغ آج کی مطلق العنانی
تمہارے ہمراہ فتح و نصرت، تمہارے قدموں میں کامرانی
مجاہدو! وہ ہے راجدھانی

■

مکان

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو، میں بھی اٹھوں، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

یہ زمیں تب بھی نگل لینے پہ آمادہ تھی
پاؤں جب ٹوٹتی شاخوں سے اتارے ہم نے
ان مکانوں کو خبر ہے نہ مکینوں کو خبر
ان دنوں کی جو گپھاؤں میں گزارے ہم نے

ہاتھ ڈھلتے گئے سانچے میں تو تھکتے کیسے
نقش کے بعد نئے نقش نکھارے ہم نے
کی یہ دیوار بلند، اور بلند، اور بلند
بام و در اور، ذرا اور سنوارے ہم نے

آندھیاں توڑ لیا کرتی تھیں شمعوں کی لویں
جڑ دیئے اس لئے بجلی کے ستارے ہم نے
بن گیا قصر تو پہرے پہ کوئی بیٹھ گیا
سو رہے خاک پہ ہم شورشِ تعمیر لئے

اپنی نس نس میں لئے محنت پیہم کی تھکن
بند آنکھوں میں اسی قصر کی تصویر لئے
دن پگھلتا ہے اسی طرح سروں پر اب تک
رات آنکھوں میں کھٹکتی ہے سیہ تیر لئے

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو، میں بھی اٹھوں، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

■

ہندوستان

تو دوست سارے زمانے کا ہے، کلام نہیں
مگر زباں پہ ہندوستاں کا نام نہیں
انہوں نے بھی میری عرضی پہ لکھ دیئے دو حرف
بلند عزم نہیں جن کا فیض عام نہیں
میں تیرا دوست تو میرے دکھوں سے بیگانہ
خطا معاف یہ کیا رنج کا مقام نہیں

■

آوارہ سجدے

(کمیونسٹ اکائی کے ٹوٹنے پر)

ایک یہی سوز نہاں کل مرا سرمایا ہے
دوستوں میں کسے یہ سوز نہاں نذر کروں
کوئی قاتل سرِ مقتل نظر آتا ہی نہیں
کس کو دل نذر کروں اور کسے جاں نذر کروں

تم بھی محبوب مرے، تم بھی ہو دلدار مرے
آشنا مجھ سے مگر تم بھی نہیں، تم بھی نہیں
ختم ہے تم پہ مسیحا نفسی، چارہ گری
محرمِ درد جگر تم بھی نہیں، تم بھی نہیں

اپنی لاش آپ اٹھانا کوئی آسان نہیں
دست و بازو مرے ناکارہ ہوئے جاتے ہیں
جن سے ہر دور میں چمکی ہے تمہاری دہلیز
آج سجدے وہی آوارہ ہوئے جاتے ہیں

دور منزل تھی، مگر ایسی بھی کچھ دور نہ تھی
لے کے پھرتی رہی رستے ہی میں وحشت مجھ کو
ایک زخم ایسا نہ کھایا کہ بہار آجاتی
دار تک لے ہی گیا شوقِ شہادت مجھ کو

راہ میں ٹوٹ گئے پاؤں تو معلوم ہوا
جز مرے اور میرا راہ نما کوئی نہیں
ایک کے بعد خدا ایک چلا آتا ہے
کہہ دیا عقل نے تنگ آکے خدا کوئی نہیں

■

نہرو

میں نے تنہا کبھی اس کو دیکھا نہیں
پھر بھی جب اس کو دیکھا وہ تنہا ملا
جیسے صحرا میں چشمہ کہیں
یا سمندر میں مینارِ نور
یا کوئی فکر اوہام میں
فکر صدیوں اکیلی اکیلی رہی
ذہن صدیوں اکیلا اکیلا ملا

اور اکیلا اکیلا بھٹکتا رہا
ہر نئے ہر پرانے زمانے میں وہ
بے زباں تیرگی میں کبھی
اور کبھی چیختی دھوپ میں
چاندنی میں کبھی خواب کی
اس کی تقدیر تھی اک مسلسل تلاش
خود کو ڈھونڈا کیا ہر فسانے میں وہ

بوجھ سے اپنے اس کی کمر جھک گئی
قد مگر اور کچھ اور بڑھتا رہا
خیر و شر کی کوئی جنگ ہو
زندگی کا ہو کوئی جہاد
یا کوئی معرکہ عشق کا
وہ ہمیشہ ہوا سب سے پہلے شہید
سب سے پہلے وہ سولی پہ چڑھتا رہا

جن تقاضوں نے اس کو دیا تھا جنم
ان کی آغوش میں پھر سمایا نہ وہ

خون میں وید گونجے ہوئے
ارر جبیں پر فروزاں اذاں
اور سینے پہ رقصاں صلیب
بے جھجک سب کے قابو میں آتا گیا
اور کسی کے بھی قابو میں آیا نہ وہ

ہاتھ میں اس کے کیا تھا جو دیتا ہمیں
صرف اک کیل، اسی کیل کا اک نشاں
نشۂ مئے کوئی چیز ہے
اک گھڑی دو گھڑی ایک رات
اور حاصل وہی درد سر
اس نے زنداں میں لیکن پیا تھا جو زہر
اٹھ کے سینے سے بیٹھا نہ اس کا دھواں

■

تبسم

اک کلی نور دیدۂ گلزار
گوہر شب چراغ باغ و بہار
نرم، نازک شگفتہ لالہ گوں
شوخ، معصوم، بے زباں طرار
مجھ پہ رنگینیاں لٹاتی تھی
لطف نظارگی مٹا ہی دیا
میں نے دست طلب بڑھا ہی دیا
پنکھڑی میں نہاں تھی چنگاری
ہاتھ جس نے مرا جلا ہی دیا
اور کلی مجھ پہ مسکراتی تھی

■

شخص اور عہد کے عوامل و اثرات

■ سوانحی اشاریے ' احوال

■■ افکار ' پیش رو شعراء

■■■ تحریکات

■■■■ معاصرین سیاسی و ادبی شخصیات

آخری رات

چاند ٹوٹا پگھل گئے تارے
قطرہ قطرہ ٹپک رہی ہے رات
پلکیں آنکھوں پہ جھکتی آتی ہیں
انکھڑیوں میں کھٹک رہی ہے رات
آج چھیڑو نہ کوئی افسانہ
آج کی رات ہم کو سونے دو

کھلتے جاتے ہیں سمٹے سکڑے جال
گھلتے جاتے ہیں خون میں بادل
اپنے گلنار پنکھ پھیلائے
آرہے ہیں اسی طرف جنگل
گل کرو شمع رکھ دو پیمانہ
آج کی رات ہم کو سونے دو

شام سے پہلے مرچکا تھا شہر
کون دروازہ کھٹکھٹاتا ہے
اور اونچی کرو یہ دیواریں
شور آنگن میں آیا جاتا ہے
کہہ دو ہے آج بند میخانہ
آج کی رات ہم کو سونے دو

جسم ہی جسم ہیں، کفن ہی کفن
بات سنتے نہ سر جھکاتے ہیں
امن کی خیر، کوتوال کی خیر
مردے قبروں سے نکلے آتے ہیں
کوئی اپنا نہ کوئی بیگانہ
آج کی رات ہم کو سونے دو

کوئی کہتا تھا ٹھیک کہتا تھا
سرکشی بن گئی ہے سب کا شعار
قتل پر جن کو اعتراض نہ تھا
دفن ہونے کو کیوں نہیں تیار
ہوش مندی ہے آج سوجانا
آج کی رات ہم کو سونے دو

■

عادت

مدتوں میں اک اندھے کنوئیں میں اسیر
سر پٹکتا رہا، گڑگڑاتا رہا
روشنی چاہئے، چاندنی چاہئے، زندگی چاہئے
روشنی پیار کی، چاندنی یار کی، زندگی دار کی

اپنی آواز سنتا رہا رات دن
دھیرے دھیرے یقیں دل کو آتا رہا
سونے سنسار میں
بے وفا یار میں
دامن دار میں

روشنی بھی نہیں
چاندنی بھی نہیں
زندگی بھی نہیں

زندگی ایک رات
واہمہ کائنات

آدمی بے ثبات
لوگ کوتاہ قد
شہر شہر حسد
گاؤں ان سے بھی بد

ان اندھیروں نے جب پیس ڈالا مجھے
پھر اچانک کنوئیں نے اچھالا مجھے
اپنے سینے سے باہر نکالا مجھے
سیکڑوں مصر تھے سامنے
سیکڑوں اس کے بازار تھے
ایک بوڑھی زلیخا نہیں
جانے کتنے خریدار تھے
بڑھتا جاتا تھا یوسف کا مول
لوگ بکنے کو تیار تھے

کھل گئے مہ جبینوں کے سر
ریشمی چادریں ہٹ گئیں
پلکیں جھپکیں نہ نظریں جھکیں
مرمریں انگلیاں کٹ گئیں
ہاتھ دامن تک آیا کوئی
دھجیاں دور تک بٹ گئیں

میں نے ڈر کے لگا دی کنوئیں میں چھلانگ
سر پٹکنے لگا پھر اسی کرب سے
پھر اسی درد سے گڑگڑانے لگا
روشنی چاہئے، چاندنی چاہئے، زندگی چاہئے

■

دائرہ

روز بڑھتا ہوں جہاں سے آگے
پھر وہیں لوٹ کے آجاتا ہوں
بارہا توڑ چکا ہوں جن کو
انہیں دیواروں سے ٹکراتا ہوں
روز بستے ہیں کئی شہر نئے
روز دھرتی میں سما جاتے ہیں
زلزلوں میں تھی ذرا سی گرمی
وہ بھی اب روز ہی آجاتے ہیں

جسم سے روح تلک ریت ہی ریت
نہ کہیں دھوپ، نہ سایہ، نہ سراب
کتنے ارمان ہیں کس صحرا میں
کون رکھتا ہے مزاروں کا حساب
نبض بجھتی بھی بھڑکتی بھی ہے
دل کا معمول ہے گھبرانا بھی
رات اندھیرے نے اندھیرے سے کہا
ایک عادت ہے جئے جانا بھی

قوس اک رنگ کی ہوتی ہے طلوع
ایک ہی چال بھی پیمانے کی
گوشے گوشے میں کھڑی ہے مسجد
شکل کیا ہوگئی میخانے کی

کوئی کہتا تھا سمندر ہوں میں
اور مری جیب میں قطرہ بھی نہیں

خیریت اپنی لکھا کرتا ہوں
اب تو تقدیر میں خطرہ بھی نہیں

اپنے ہاتھوں کو پڑھا کرتا ہوں
کبھی قرآں کبھی گیتا کی طرح
چند ریکھاؤں میں سماؤں میں
زندگی قید ہے سیتا کی طرح

رام کب لوٹیں گے معلوم نہیں
کاش راون ہی کوئی آجاتا

■

ابن مریم

تم خدا ہو
خدا کے بیٹے ہو
یا فقط امن کے پیغمبر ہو
یا کسی کا حسیں تخیل ہو
جو بھی ہو مجھ کو اچھے لگتے ہو
مجھ کو سچے لگتے ہو

اس ستارے میں جس میں صدیوں کے
جھوٹ اور کذب کا اندھیرا ہے
اس ستارے میں، جس کو ہر رخ سے
رینگتی سرحدوں نے گھیرا ہے
اس ستارے میں، جس کی آبادی
امن بوتی ہے جنگ کاٹتی ہے
رات پیتی ہے نور مکھڑوں کا
صبح سینوں کا خون چاٹتی ہے

تم نہ ہوتے تو جانے کیا ہوتا
تم نہ ہوتے تو اس ستارے میں
دیوتا، راکشش، غلام، امام
پارسا، رند، راہبر، رہزن
برہمن، شیخ، پادری، بھکشو
سبھی ہوتے مگر ہمارے لئے
کون چڑھتا خوشی سے سولی پر

جھونپڑیوں میں گھر ایہ ویرانہ
مچھلیاں دن میں سوکھتی ہیں جہاں
بلّیاں دور بیٹھی رہتی ہیں
اور خارش زدہ سے کچھ کتے
لیٹے رہتے ہیں بے نیازانہ
دم مروڑے کہ کوئی سر کچلے
کاٹنا کیا وہ بھونکتے بھی نہیں

اور جب وہ دہکتا انگارہ
چھن سے ساگر میں ڈوب جاتا ہے
تیرگی اوڑھ لیتی ہے دنیا
کشتیاں کچھ کنارے آتی ہیں
بھنگ، گانجا، چرس، شراب، افیون
جو بھی لائیں، جہاں سے بھی لائیں
دوڑتے ہیں ادھر سے کچھ سائے
اور سب کچھ اتار لاتے ہیں

گاڑی جاتی ہے عدل کی میزان
جس کا حصہ اسی کو ملتا ہے

یہاں خطرہ نہیں خیانت کا
تم یہاں کیوں کھڑے ہو مدت سے

یہ تمہاری تھکی تھکی بھیڑیں
رات جن کو زمیں کے سینے پر
صبح ہوتے انڈیل دیتی ہے
منڈیوں، دفتروں، ملوں کی طرف
ہانک دیتی، ڈھکیل دیتی ہے
راستے میں یہ رک نہیں سکتیں
توڑ کے گھٹنے جھک نہیں سکتیں
ان سے تم کیا توقع رکھتے ہو
بھیڑیا ان کے ساتھ چلتا ہے

تکتے رہتے ہو اس سڑک کی طرف
دفن جس میں کئی کہانیاں ہیں
دفن جس میں کئی جوانیاں ہیں
جس پہ اک ساتھ بھاگی پھرتی ہیں
خالی جیبیں بھی اور تجوریاں بھی
جانے کس کا ہے انتظار تمہیں

مجھ کو دیکھو کہ میں وہی تو ہوں
جس کو کوڑوں کی چھاؤں میں دنیا
بیچتی بھی خریدتی بھی تھی
مجھ کو دیکھو کہ میں وہی تو ہوں
جس کو کھیتوں سے ایسے باندھا تھا
جیسے میں ان کا ایک حصہ تھا
کھیت بکتے تو میں بھی بکتا تھا

مجھ کو دیکھو کہ میں وہی تو ہوں
کچھ مشینیں بنائیں جب میں نے
ان مشینوں کے مالکوں نے مجھے
بے جھجک ان میں ایسے جھونک دیا
جیسے میں کچھ نہیں ہوں ایندھن ہوں

مجھ کو دیکھو کہ میں تھکا ہارا
پھر رہا ہوں یگوں سے آوارہ
تم یہاں سے ہٹو تو آج کی رات
سو رہوں میں اسی چبوترے پر
تم یہاں سے ہٹو خدا کے لئے

جاؤ وہ ویت نام کے جنگل
اس کے مصلوب شہر، زخمی گاؤں
جن کو انجیل پڑھنے والوں نے
روند ڈالا ہے، پھونک ڈالا ہے
جانے کب سے پکارتے ہیں تمہیں

جاؤ اک بار پھر ہمارے لئے
تم کو چڑھنا پڑے گا سولی پر

■

بھروپنی

ایک گردن پہ سیکڑوں چہرے
اور ہر چہرے پر ہزاروں داغ
اور ہر داغ بند دروازہ
روشنی ان سے آ نہیں سکتی
روشنی ان سے جا نہیں سکتی

تنگ سینہ ہے حوضِ مسجد کا
دل وہ دونا پجاریوں کے بعد
چاٹتے رہتے ہیں جسے کتے
کتے دونا جو چاٹ لیتے ہیں
دیوتاؤں کو کاٹ لیتے ہیں

جانے کس کوکھ نے جنا اس کو
جانے کس صحن میں جوان ہوئی
جانے کس دیس سے چلی کمبخت
ویسے یہ ہر زبان بولتی ہے
زخم کھڑکی کی طرح کھولتی ہے

اور کہتی ہے جھانک کر دل میں
تیرا مذہب، ترا عظیم خدا
تیری تہذیب کے حسین صنم
سب کو خطرے نے آج گھیرا ہے
بعد ان کے جہاں اندھیرا ہے

سرد ہو جاتا ہے لہو میرا
بند ہو جاتی ہیں کھلی آنکھیں
ایسا لگتا ہے جیسے دنیا میں
سبھی دشمن ہیں کوئی دوست نہیں
مجھ کو زندہ نگل رہی ہے زمیں

ایسا لگتا ہے راکشس کوئی
ایک گاگر کمر میں لٹکا کر
آسماں پر چڑھے گا آخر شب
نور سارا نچوڑ لائے گا
میرے تارے بھی توڑ لائے گا

یہ جو دھرتی کا پھٹ گیا سینہ
اور باہر نکل پڑے ہیں جلوس
مجھ سے کہتے ہیں تم ہمارے ہو
میں اگر ان کا ہوں تو میں کیا ہوں
میں کسی کا نہیں ہوں اپنا ہوں

مجھ کو تنہائی نے دیا ہے جنم
میرا سب کچھ اکیلے پن سے ہے
کون پوچھے گا مجھ کو میلے میں
ساتھ جس دن قدم بڑھاؤں گا
چال میں اپنی بھول جاؤں گا

یہ اور ایسے ہی چند اور سوال
ڈھونڈنے پر بھی آج تک مجھ کو
جن کے ماں باپ کا ملا نہ سراغ
ذہن میں یہ انڈیل دیتی ہے
مجھ کو مٹھی میں بھینچ لیتی ہے

چاہتا ہوں کہ قتل کر دوں اسے
وار لیکن جب اس پہ کرتا ہوں
میرے سینے پہ زخم ابھرتے ہیں
میرے ماتھے سے خوں ٹپکتا ہے
جانے کیا میرا اس کا رشتہ ہے

آندھیوں میں اذان دی میں نے
سنکھ پھونکا اندھیری راتوں میں
گھر کے باہر صلیب لٹکائی
ایک اک در سے اس کو ٹھکرایا
شہر سے دور جاکے پھینک آیا

اور اعلان کر دیا کہ اٹھوں
برف سی جم گئی ہے سینوں پر
گرم بوسوں سے اس کو پگھلا دو
کرلو جو بھی گناہ وہ کم ہے
آج کی رات جشنِ آدم ہے

یہ مری آستین سے نکلی
رکھ دیا دوڑ کے چراغ پہ ہاتھ
مل دیا پھر اندھیرا چہرے پر
ہونٹ سے دل کی بات لوٹ گئی
در تک آکے برات لوٹ گئی

اس نے مجھ کو الگ بلا کے کہا
آج کی زندگی کا نام ہے خوف
خوف ہی وہ زمین ہے جس میں
فرقے اگتے ہیں فرقے پلتے ہیں
دھارے ساگر سے کٹ کے چلتے ہیں

خوف جب تک دلوں میں باقی ہے
صرف چہرہ بدلتے رہنا ہے
صرف لہجہ بدلتے رہنا ہے
کوئی مجھ کو مٹا نہیں سکتا
جشن آدم منا نہیں سکتا

■

نذرانہ

تم پریشان نہ ہو باب کرم وا نہ کرو
اور کچھ دیر پکاروں گا چلا جاؤں گا
اسی کوچے میں جہاں چاند اُگا کرتے ہیں
شبِ تاریک گذاروں گا چلا جاؤں گا

راستہ بھول گیا' یا یہی منزل ہے مری
کوئی لایا ہے کہ خود آیا ہوں معلوم نہیں
کہتے ہیں حسن کی نظریں بھی حسیں ہوتی ہیں
میں بھی کچھ لایا ہوں' کیا لایا ہوں معلوم نہیں

یوں تو جو کچھ تھا مرے پاس میں سب بیچ آیا
کہیں انعام ملا' اور کہیں قیمت بھی نہیں
کچھ تمہارے لئے آنکھوں میں چھپا رکھا ہے
دیکھ لو اور نہ دیکھو تو شکایت بھی نہیں

ایک تو اتنی حسیں دوسرے یہ آرائش
جو نظر پڑتی ہے چہرے پہ ٹھہر جاتی ہے
مسکرا دیتی ہو ہورسما بھی اگر محفل میں
اک دھنک ٹوٹ کے سینوں میں بکھر جاتی ہے

گرم بوسوں سے تراشا ہوا نازک پیکر
جس کی اک آنچ سے ہر روح پگھل جاتی ہے
میں نے سوچا ہے تو سب سوچتے ہوں گے شاید
پیاس اس طرح بھی کیا سانچے میں ڈھل جاتی ہے

کیا کمی ہے جو کروگی مرا نذرانہ قبول
چاہنے والے بہت' چاہ کے افسانے بہت

ایک ہی رات سہی گرمیٔ ہنگامۂ عشق
ایک ہی رات میں جل مرتے ہیں پروانے بہت

پھر بھی اک رات میں سو طرح کے موڑ آتے ہیں
کاش تم کو کبھی تنہائی کا احساس نہ ہو
کاش ایسا نہ ہو گھیرے رہے دنیا تم کو
اور اس طرح کہ جس طرح کوئی پاس نہ ہو

آج کی رات جو میری ہی طرح تنہا ہے
میں کسی طرح گذاروں گا چلا جاؤں گا
تم پریشاں نہ ہو، بابِ کرم وا نہ کرو
اور کچھ دیر پکاروں گا چلا جاؤں گا

■

ایک دعا

(شبانہ کے جنم دن پر)

اب اور کیا تیرا بیمار باپ دے گا تجھے
بس اک دعا کہ خدا تجھ کو کامیاب کرے
وہ ٹانک دے تیرے آنچل میں چاند اور تارے
تو اپنے واسطے جس کو بھی انتخاب کرے

■

دوسرا طوفان

اور پھر ایک رات ایسی آئی
میکدے بجھ گئے
سارے آتش کدے بجھ گئے
میکدوں اور آتش کدوں کا نقیب
اک مجاہد ادیب
زندگی کے لئے
جو ہمیشہ مشیت سے لڑتا رہا
آدمی کے لئے
جو خدا کا گریباں پکڑتا رہا
لڑتے لڑتے وہ اک روز چپ ہو گیا
اپنے ہی اک صحیفے سے منہ ڈھانپ کے سو گیا
لیکن اس کا قلم
جس کے سو نام ہیں
جس کے سو کام ہیں
لڑ رہا ہے اسی ڈھنگ سے آج تک
چل رہا ہے اسی رنگ سے آج تک
گاہ اس ہاتھ میں
گاہ اُس ہاتھ میں
چلتے چلتے کئی انگلیاں مڑ گئیں
اور کئی انگلیوں نے بُنیں
نت نئی سازشیں
نت نئی رسیاں
اور پھر اس کو سولی پر لٹکا دیا
عرش سے کوئی پیغام آیا نہیں
آسمانوں پہ اس کو بلایا نہیں
اس کی ٹوٹی ہوئی پسلیوں سے مگر
اس طرح خون رسنے ٹپکنے لگا
رسیاں جل گئیں
سازشیں گل گئیں
نوح کے عہد کا یہ فسانہ نہیں
آج کی بات ہے
اس نے نوک زباں پر سمندر اٹھایا
اٹھا کر فضاؤں میں پھیلا دیا
کرۂ ارض کو لے کر منقار میں
یوں اچھالا خلاؤں میں لٹکا دیا
دشت و در کانپ اٹھے
بحر و بر کانپ اٹھے
بے خبر کانپ اٹھے
باخبر کانپ اٹھے
یہ وہ طوفاں نہیں ڈوب جاتی ہے جس میں زمیں
اس میں ڈوبی زمینیں ابھر آتی ہیں

■

پھرہ

عزم کا کوہ گراں درد کی دیوار ہیں ہم
زخم کا زخم ہیں تلوار کی تلوار ہیں ہم
جیسے جھپکی نہیں صدیوں سے یہ بوجھل پلکیں
آج کی رات کچھ اس طرح سے بیدار ہیں ہم
جال سرحد سے اٹھا جال بچھانے والے

جب ملی آنکھ ملی موت کا نذرانہ لئے
جب ہلے ہونٹ ہلے زہر کا پیمانہ لئے
خون بہتا ہے تو بن جاتی ہے تصویر تری
جنگ اِس ہاتھ میں اُس ہاتھ میں ویرانہ لئے
تجھ سا دیکھا نہ سنا خون بہانے والے

زندگی تیرے تصور سے بھی گھبراتی ہے
اتنا نزدیک نہ آ سانس گھٹی جاتی ہے
تو نے سونے کے کٹورے میں یہ کیا شئے پی لی
گرم سانسوں سے سڑے خون کی بو آتی ہے
منہ ادھر پھیر ذرا پیار جتانے والے

تیرا احسان جو لیں اپنی بہاریں بھولیں
کھیت میں قحط اُگیں باغ میں سنکٹ پھولیں
پیاس بن جائے مقدر جو پئیں تیری شراب
آبلے ہاتھ میں پڑ جائیں جو ساغر چھولیں
یہ رہا جام ترا زہر پلانے والے

قسمتیں بن کے ترے دم سے بگڑ جاتی ہیں
بستیاں دل کی طرح بس کے اجڑ جاتی ہیں

■ سوانحی اشاریے

نام : اطہر حسین رضوی
قلمی نام ۱ : کیفی اعظمی
والد : فتح حسین رضوی
والدہ : کنیز فاطمہ
جائے پیدائش : مجواں، ضلع اعظم گڑھ، یوپی
تاریخ پیدائش ۲ : بحوالہ انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا-۱۹۱۸، مظفر حنفی-۱۹۱۸
احتشام حسین-۱۹۱۷، تذکرہ ماہ سال-۱۹۲۴، کیفی-نامعلوم
تاریخ وفات : ۱۰ مئی ۲۰۰۲، بروز جمعہ، ۷ بجے صبح
بھائی : سید ظفر حسین، سید یوسف حسین، سید بشیر حسین
بالترتیب تخلص: بیتاب، مجروح، وفا (تینوں صاحب بیاض شاعر)
بہنیں : قمر النساء، واجدہ، آمنہ، بوسینا، شبیری
شریک حیات : شوکت کیفی، عرف 'موتی'
اولادیں ۳ : پہلا بچہ، نمونیہ سے موت واقع ہوئی۔
شبانہ اعظمی، عرف 'منی'-احرا اعظمی، عرف 'بابا'

تعلیم ۴ : ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔
دبیر ماہر (فارسی)، دبیر کامل (فارسی)، عالم (عربی)، لکھنؤ یونیورسٹی
منشی (فارسی)، منشی کامل (فارسی)، اعلیٰ کامل (اردو)، الہ آباد یونیورسٹی

تخلیقات : مجموعہ ہائے کلام:
پہلا— 'جھنکار' ۱۹۴۳

تیل پی لیتی ہے آنسو کی طرح ڈر کے زمیں
منڈیاں تیری بھنک پا کے سکڑ جاتی ہیں
سکہ کھوٹا ہے ترا داؤں لگانے والے

نرم شاخوں نے لچکنے کی سزا پائی ہے
ایک اک پھول کو ترسا کے بہار آئی ہے
تارے اترے ہیں زمیں پر کہ کھلا ہے بیلا
ڈھاک پھولا ہے کہ شعلوں کی گھٹا چھائی ہے
ہے بہت گرم فضا شاخ جھکانے والے

ہم وہ راہی ہیں جو منزل کی خبر رکھتے ہیں
پاؤں کانٹوں پہ شگوفوں پر نظر رکھتے ہیں
کتنی راتوں سے نچوڑا ہے اجالا ہم نے
رات کی قبر پہ بنیادِ سحر رکھتے ہیں
او اندھیرے کے خدا شمع بجھانے والے

■

پیار کا جشن

پیار کا جشن نئی طرح منانا ہوگا
غم کسی دل میں سہی غم کو مٹانا ہوگا

کانپتے ہونٹوں پہ پیمان وفا کیا کہنا
تجھ کو لائی ہے کہاں لغزش پا کیا کہنا
میرے گھر میں ترے مکھڑے کی ضیا کیا کہنا
آج ہر گھر کا دیا مجھ کو جلانا ہوگا

روح چہروں پہ دھواں دیکھ کے شرماتی ہے
جھینپی جھینپی سی مرے لب پہ ہنسی آتی ہے
تیرے ملنے کی خوشی درد بنی جاتی ہے
ہم کو ہنسنا ہے تو اوروں کو ہنسانا ہوگا

سوئی سوئی ہوئی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے جام
کھوئی کھوئی ہوئی نظروں میں محبت کا پیام
لب شیریں پہ مری تشنہ لبی کا انعام
جانے انعام ملے گا کہ چرانا ہوگا

میری گردن میں تری صندلی بانہوں کا یہ ہار
ابھی آنسو تھے ان آنکھوں میں ابھی اتنا خمار
میں نہ کہتا تھا مرے گھر میں بھی آئے گی بہار
شرط اتنی تھی کہ پہلے تجھے آنا ہوگا

■

اجنبی

اے ہمہ رنگ ہمہ نور ہمہ سوز و گداز
بزمِ مہتاب سے آنے کی ضرورت کیا تھی
تو جہاں تھی اسی جنت میں نکھرتا ترا روپ
اس جہنم کو بسانے کی ضرورت کیا تھی

یہ خدوخال پہ خوابوں سے تراشا ہوا جسم
اور دل جس پہ خدوخال کی نرمی بھی نثار
خار ہی خار شرارے ہی شرارے ہیں یہاں
اور تھم تھم کے اٹھا پاؤں بہاروں کی بہار

تشنگی زہر بھی پی جاتی ہے امرت کی طرح
جانے کس جام پہ رک جائے نگاہِ معصوم
ڈوبتے دیکھا ہے جن آنکھوں میں میخانہ بھی
پیاس ان کی آنکھوں کی بجھے یا نہ بجھے کیا معلوم

ہیں سبھی حسن پرست اہلِ نظر صاحبِ دل
کوئی گھر میں کوئی محفل میں سجائے گا تجھے
تو فقط جسم نہیں، شعر بھی ہے، گیت بھی ہے
کون اشکوں کی گھنی چھاؤں میں گائے گا تجھے

تجھ سے اک درد کا رشتہ بھی ہے بس پیار نہیں
اپنے آنچل پہ مجھ اشک بہالینے دے
تو جہاں جاتی ہے جا روکنے والا میں کون
رستے رستے میں مگر شمع جلا لینے دے

■

تصادم

دو نگاہوں کا اچانک وہ تصادم مت پوچھ
ٹھیس لگتے ہی اڑا عشق شرارہ بن کر

اڑ کے پہلے انہیں جھینپی ہوئی نظروں میں رُکا
نرم، معصوم، حسیں، مست شرارہ بن کر

پھر نگہہ سے عرق آلود جبیں پر جھلکا
پنکھڑی، پھول، گہر، لعل ستارہ بن کر

ڈھل کے ماتھے سے اتر آیا گل عارض میں
رنگ، رس، شہد نہیں ان سے بھی پیارا بن کر

گل عارض سے سمٹ آیا لبِ رنگیں میں
راگ، مے، لہر، ہنسی، برق کا دھارا بن کر

لبِ گل رنگ سے پھر رینگ گیا بانہوں میں
موج، نم، جذب، مچلتا ہوا پارہ بن کر

بس کے بانہوں کی گدازی میں چلا دل کی طرف
چاہ الطاف کرم، پیار مدارا بن کر

دل میں ڈوبا تھا کہ بس پھوٹ پڑا رگ رگ سے
جانِ دل، جانِ نظر، جانِ نظارہ بن کر

پیکرِ حسن سے پھر اڑا کے چلا میری طرف
ایک بدمست جوانی کا اتارا بن کر

رہزنِ ہوش مگر ہوش کا پیغام لئے
دشمنِ ضبط مگر ضبط کا یارا بن کر

آتے ہی چھا گیا کھوئی ہوئی ہستی پہ مری
میری کھوئی ہوئی ہستی کا سہارا بن کر

اب شرارہ وہی اس کے لب و رخسار میں ہے
اور کیفی مرے تپتے ہوئے اشعار میں ہے

■

تجدید

تلاطم، ولولے، ہیجان، ارمان
سب اس کے ساتھ رخصت ہو چکے تھے
یقیں تھا اب نہ ہنسنا ہے نہ رونا
کچھ اتنا ہنس چکے تھے رو چکے تھے

کسی نے آج اک انگڑائی لے کر
نظر میں ریشمی گرہیں لگا دیں
تلاطم، ولولے، ہیجان، ارمان
وہی چنگاریاں پھر مسکرا دیں

■

دوپھر

یہ جیت ہار تو اس دور کا مقدر ہے
یہ دور جو کہ پرانا نہیں نیا بھی نہیں
یہ دور جو کہ سزا بھی نہیں جزا بھی نہیں
یہ دور جس کا بظاہر کوئی خدا بھی نہیں

تمہاری جیت اہم ہے نہ میری ہار اہم
کہ ابتداء بھی نہیں ہے یہ انتہا بھی نہیں
شروع معرکہء جاں ابھی ہوا بھی نہیں
شروع ہو تو یہ ہنگام فیصلہ بھی نہیں

پیامِ زیرِ لب اب تک ہے صورِ اسرافیل
سنا کسی نے کسی نے ابھی سنا بھی نہیں
کیا کسی نے کسی نے یقین کیا بھی نہیں
اٹھا زمین سے کوئی، کوئی اٹھا بھی نہیں

یہ کارواں ہے تو انجامِ کارواں معلوم
کہ اجنبی بھی نہیں کوئی آشنا بھی نہیں
کسی سے خوش بھی نہیں ہے کوئی خفا بھی نہیں
کسی کا حال کوئی مڑ کے پوچھتا بھی نہیں

■

ماسکو

ساتھیوں قافلۂ شوق کو روکو تو ذرا
زندگی چار طرف زمزمہ خواں ہے دیکھو
اپنے خوابوں میں جسے ہم نے بسا رکھا تھا
یہ وہی شہرِ حسیں شہرِ جواں ہے دیکھو

پرچم امن بلند اور بلند اور بلند
تیرے سائے سے نکل کے میں کہاں جاؤں گا
ماسکو ساز اٹھا، ساز اٹھا، ساز اٹھا
آج ہر گیت اسی ساز پہ میں گاؤں گا

کیسے خاموش رہوں گا کہ ابھی تک دل میں
پچھلے ہی شور قیامت کی دھمک باقی ہے
میری جھلسی ہوئی یادوں میں گھٹی سانسوں میں
اب بھی بارود کی تھوڑی سی مہک باقی ہے

اب بھی احساس میں کانٹے کی طرح چبھتے ہیں
وہ حسیں پھول جو ہنسنے کو کبھی ترسے تھے
آج بھی خون سا رستا ہے مرے گیتوں سے
جس پہ خونخوار فضا سے کبھی بم برسے تھے

کتنے پاگل تھے وہ ایام کہ جن میں خالق
اپنی مخلوق کے اعمال پہ شرمایا تھا
ہیروشیما نے وہ جوڑا ابھی باندھا بھی نہیں
اپنی ہی لاش پر اک روز جو بکھرایا تھا

جنگ ٹل سکتی ہے، رک سکتی ہے، مٹ سکتی ہے
جنگ قسمت ہی سہی دل کا تقاضا تو نہیں

سب ترے ساتھ ہیں، میں، میرا وطن میرے رفیق
آج تو جہد کے میدان میں تنہا تو نہیں

اک قدم بھی جو بڑھاتا ہے تو منزل کی طرف
اک دیا اور سرِ راہ عمل جلتا ہے
تو جو مڑتا ہے تو مڑ جاتی ہے ساری دنیا
تو جو چلتا ہے ترے ساتھ جہاں چلتا ہے

کتنی مشکل سے یہ ٹوٹے ہوئے دل جوڑے ہیں
ان کے ٹکڑوں کو دوبارہ نہ بکھرنے دیں گے
راہیں جاتی ہیں جو میخانے سے میخانے تک
ہم ادھر سے کبھی فوجیں نہ گزرنے دیں گے

■

گربہ وتی

سن رہا ہوں یہی بے صوت کراہیں کب سے
ہے مگر کرب ہمیشہ سے سوا آج کی رات
نہ تو سویا ہے نہ سوئے گا خدا آج کی رات

دائی خاموش کھڑی گھول رہی ہے افیون
گھنٹیاں بجتی ہیں مسجد میں دعا ہوتی ہے
نیند ہی ایسے مریضوں کی دوا ہوتی ہے

پہلے بچے میں ہوا کرتی ہے تکلیف اکثر
آخری ہوکے اٹھا رکھا ہے طوفان اس نے
کر دیا ماں کو بھی دائی کو بھی ہلکان اس نے

ایسے مولود سے بھلا دنیا کا کیا ہوگا

کلبلانے سے ہمکنے کا ہے انداز جدا
ماں سے انجام جدا، باپ سے آغاز جدا

کوکھ سے اس کی بہر حال پر امید رہیں
کہتے ہیں گربھ وتی اتنی بھی معصوم نہیں
راکشس ہوگا کہ اوتار یہ معلوم نہیں

اس تذبذب سے تھکے ذہن کو مل جائے نجات
بے اثر جو ہے دوا کام دعا تو کر جائے
ماں سے کچھ خوف نہیں کوکھ میں بچہ مر جائے

اور جراح یہ کہتے ہیں کہ یہ پاپ کا پھل
آج اکیلا نہیں مرتا ہے تو ماں بھی مر جائے
اور یہ کشمکش سود و زیاں بھی مر جائے

یہ بھی ممکن ہے کہ بچہ جسے ہم سمجھے ہیں
پیٹ کھلنے پہ وہ جلتا ہوا پھوڑا نکلے
خون بہتا ہے بہے زہر تو تھوڑا نکلے

کچھ دوا سے نہ ہوا ہے نہ دعا سے ہوگا
میز تیار کرو گربھ وتی کو لے آؤ
پیٹ کو چاک کرو کوکھ پہ نشتر برساؤ

کون سا وقت تھا دن کیسے تھے ہاں یاد آیا
جنگ اس وقت تھی، اب جنگ کی تیاری ہے
تب سے اب تک وہی منحوس عمل جاری ہے

شل ہوئے جاتے ہیں جراحوں کے دست و بازو
پیٹ میں لگتی ہے آری نہ چھری دھنستی ہے
میز پر لیٹی ہوئی گربھ وتی ہنستی ہے

■

انتشار

کبھی جمود کبھی صرف انتشار سا ہے
جہاں کو اپنی تباہی کا انتظار سا ہے
منو کی مچھلی، نہ کشتیٔ نوح اور یہ فضا
کہ قطرے قطرے میں طوفان بے قرار سا ہے
میں کس کو اپنے گریباں کا چاک دکھلاؤں
کہ آج دامنِ یزداں بھی تار تار سا ہے
سجا سنوار کے جس کو ہزار ناز کئے
اسی پہ خالقِ کونین شرمسار سا ہے
تمام جسم ہے بیدار، فکر خوابیدہ
دماغ پچھلے زمانے کی یادگار سا ہے
سب اپنے پاؤں پہ رکھ رکھ کے پاؤں چلتے ہیں
خود اپنے دوش پہ ہر آدمی سوار سا ہے
جسے پکاریئے ملتا ہے اک کھنڈر سے جواب
جسے بھی دیکھئے ماضی کا اشتہار سا ہے
ہوئی تو کیسے بیاباں میں آکے شام ہوئی
کہ جو مزار یہاں ہے مرا مزار سا ہے
کوئی تو سود چکائے کوئی تو ذمہ لے
اس انقلاب کا آج تک ادھار سا ہے

■

دوسرا— 'آخر شب' ۱۹۴۷
تیسرا— 'آوارہ سجدے' ۱۹۷۳
چوتھا— 'میری آواز سنو' (فلمی نغمے) ۱۹۷۴
پانچواں— 'سرمایہ' ۱۹۹۸
طویل نظم— 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' (دوسرا اجلاس) ۱۹۷۷
نثر— ساحر لدھیانوی: (خاکہ) ۱۹۴۸
سرمایہ— (کلیات) ۱۹۹۴
نئی گلستاں— (ہندی دو جلدوں میں) ۲۰۰۱
(اردو بلٹز بمبئی میں 'نئی گلستاں' کے تحت شائع ہونے والا طنزیہ کالم)
کیفیات— (کلیات) ۲۰۰۳

اعزازات وانعامات :
: اتر پردیش اردو اکادمی کا اوّل انعام 'آوارہ سجدے'
: مہاراشٹریہ اردو اکادمی کا خصوصی انعام 'آوارہ سجدے'
: سوویت نہرو ایوارڈ 'آوارہ سجدے'
: ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 'آوارہ سجدے'
: لوٹس ایوارڈ 'آوارہ سجدے'
: نیشنل اینٹی گریشن کا پریسیڈنٹ ایوارڈ 'سات ہندوستانی' (فلم کے ایک گیت پر)
: بہترین فلمی کہانی کا فلم فیئر ایوارڈ 'گرم ہوا' (فلم)
: بہترین فلمی مکالمے کا فلم فیئر ایوارڈ 'گرم ہوا'
: بہترین فلمی منظر نامے کا فلم فیئر ایوارڈ 'گرم ہوا'
: مہاراشٹریہ اسٹیٹ کا گورو ایوارڈ 'ادبی خدمات' (ایک لاکھ روپے نقد)
: ایفرو ایشین رائٹرس ایوارڈ
: حکومت مہاراشٹر کا گیانیشور ایوارڈ
: ساہتیہ اکادمی کا فیلوشپ

فرغانہ

یہی تحفہ ہے یہی نذرانہ
میں جو آوارہ نظر لایا ہوں
رنگ میں تیرے ملانے کے لئے
قطرۂ خون جگر لایا ہوں

اے گلابوں کے وطن

پہلے کب آیا ہوں کچھ یاد نہیں
لیکن آیا تھا قسم کھاتا ہوں
پھول تو پھول ہیں کانٹوں پہ ترے
اپنے ہونٹوں کے نشاں پاتا ہوں

میرے خوابوں کے وطن

چوم لینے دے مجھے ہاتھ اپنے
جن سے توڑی ہیں کئی زنجیریں
تو نے بدلا ہے مشیت کا مزاج
تو نے لکھی ہے نئی تقدیریں

انقلابوں کے وطن

پھول کے بعد نئے پھول کھلیں
کبھی خالی نہ ہو دامن تیرا
روشنی روشنی تیری راہیں
چاندنی چاندنی آنگن تیرا

ماہتابوں کے وطن

■

لینن

آسماں اور بھی اوپر کو اٹھا جاتا ہے
تم نے سو سال میں انساں کو کیا کتنا بلند
پشت پر باندھ دیا تھا جنہیں جلادوں نے
پھینکتے ہیں وہی ہاتھ آج ستاروں پہ کمند

دیکھتے ہو کہ نہیں

جگمگا اٹھی ہے محنت کے پسینے سے جبیں
اب کوئی خطِ تقدیر نہیں ہو سکتا
تم کو ہر ملک کی سرحد پہ کھڑے دیکھا ہے
اب کوئی ملک ہو تسخیر نہیں ہو سکتا

خیر ہو بازوئے قاتل کی مگر خیر نہیں
آج مقتل میں بہت بھیڑ نظر آتی ہے
کر دیا تھا کبھی ہلکا سا اشارہ جس سمت
ساری دنیا اسی جانب کو مڑی جاتی ہے

حادثہ کتنا کڑا ہے کہ سرِ منزلِ شوق
قافلہ چند گروہوں میں بٹا جاتا ہے
ایک پتھر سے تراشی تھی جو تم نے دیوار
اک خطرناک شگاف اس میں نظر آتا ہے

دیکھتے ہو کہ نہیں

دیکھتے ہو تو کوئی صلح کی تدبیر کرو
ہو سکیں زخم رفو جس سے وہ تقریر کرو
عہد پیچیدہ مسائل ہیں سوا پیچیدہ
ان کو سلجھاؤ صحیفہ کوئی تحریر کرو

روحیں آوارہ ہیں دے دو انہیں پیکر اپنا
بھر دو ہر پارۂ فولاد میں جوہر اپنا
رہ نما پھرتے ہیں یا پھرتی ہیں بے سر لاشیں
رکھ دو ہرا کڑی ہوئی لاش پہ تم سر اپنا

■

ناقص بھرتی

ہوا جب الکشن کا سورج طلوع
ہوئی لیگ میں عام بھرتی شروع
نکالے ہوئے پھر بلائے گئے
دغا باز سر پر بٹھائے گئے

بہت دن سے تھا دل میں پیچ و تاب
ملے خضر کا کوئی بڑھیا جواب
جو اتنا ہی بھاری زمیندار ہو
جو ایسا ہی محبوب سرکار ہو

پڑی نون پر لیگ کی جب نظر
گلے سے لگا ہی لیا دوڑ کر
چمکدار کپڑا جو بھایا اسے
تو ٹوپی میں جھٹ پٹ چھپایا اسے

■

کھلونے

ریت کی ناؤ جھاگ کے مانجھی
کاٹھ کی ریل سیپ کے ہاتھی
ہلکی بھاری پلاسٹک کی کلیں
موم کے چاک جو رکیں نہ چلیں
راکھ کے کھیت، دھول کے کھلیان
بھاپ کے پیرہن، دھوئیں کے مکان
نہر جادو کی، پل دعاؤں کے
جُھن جُھنے چند یوجناؤں کے
سوت کے چیلے، مونج کے استاد
تیشے دفتی کے، کانچ کے فرہاد
عالم آٹے کے اور روئے کے امام
اور پنّی کے شاعران کرام
اون کے تیز روئی کی شمشیر
صدر مٹی کا اوربر کے وزیر
اپنے سارے کھلونے ساتھ لئے
دستِ خالی میں کائنات لئے
دوستونوں میں باندھ کے رسی
ہم خدا جانے کب سے چلتے ہیں
نہ تو گرتے ہیں نہ سنبھلتے ہیں

■

بنگلہ دیش

میں کوئی ملک نہیں ہوں کہ جلا دو گے مجھے
کوئی دیوار نہیں ہوں کہ گرا دو گے مجھے
کوئی سرحد بھی نہیں ہوں کہ مٹا دو گے مجھے
یہ جو دنیا کا پرانا نقشہ
میز پر تم نے بچھا رکھا ہے

اس میں کاواکِ لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
تم مجھے اس میں کہاں ڈھونڈتے ہو
میں اک ارمان ہوں دیوانوں کا
سخت جاں خواب ہوں، کچلے ہوئے انسانوں کا

لوٹ جب حد سے سوا ہوتی ہے
ظلم جب حد سے گذر جاتا ہے
میں اچانک کسی کونے میں نظر آتا ہوں
کسی سینے سے ابھر آتا ہوں

آج سے پہلے بھی تم نے مجھے دیکھا ہوگا
کبھی مشرق میں کبھی مغرب میں
کبھی شہروں میں کبھی گاؤں میں
کبھی بستی میں کبھی جنگل میں
میری تاریخ ہی تاریخ ہے، جغرافیہ کوئی بھی نہیں
اور تاریخ بھی ایسی، جو پڑھائی تو نہیں جا سکتی
لوگ چھپ کر پڑھا کرتے ہیں
کہ میں غالب کبھی مغلوب ہوا
قاتلوں کو کبھی سولی پہ چڑھایا میں نے
اور کبھی آپ ہی مصلوب ہوا

فرق اتنا ہے کہ قاتل مرے مر جاتے ہیں
میں نہ مرتا ہوں نہ مر سکتا ہوں
کتنے نادان ہو تم
تم نے خیرات میں پائے ہیں جو ٹینک
ان کو لے کر میرے سینے پہ چڑھے آتے ہو
رات دن کرتے ہو ناپام بموں کی بارش
دیکھو تھک جاؤ گے

کون سے ہاتھ پہناؤ گے زنجیر بتاؤ
کہ مرے ہاتھ تو ہیں سات کروڑ
کون سا سر مری گردن سے جدا کر دو گے
میری گردن پہ ہیں سر سات کروڑ

■

دھماکہ

(چاروں مجمدار کی یاد میں)

کوئی چوراہا ہو چاہے کوئی ناکہ دوستو!
ہر گھڑی ہر دم کوئی تازہ دھماکہ دوستو!
یہ دھماکہ بس دھماکہ ہے
دھماکے کے سوا کچھ بھی نہیں
روٹی دے سکتا نہیں
یہ روزی دے سکتا نہیں
اس کی جیبوں میں نہ دنیا ہے نہ دین
اس کی مٹھی میں نہ زر ہے نہ زمین
روس ہے اس کی نگاہوں میں نہ چین
یہ دھماکہ بس دھماکہ ہے دھماکے کے سوا کچھ بھی نہیں

میں کھڑا تھا کب سے اس خاموش قبرستان میں
قبریں سب خاموش تھیں
قبروں میں رہنے والے سب خاموش تھے
کھا رہے تھے کیڑے چپکے چپکے بوسیدہ کفن
سبز نیلے پیلے سیہ رنگے کفن
لاشیں سب ننگی تھیں لاشوں سے سوا ننگے کفن
میں نے ہاتھوں کو ہلایا اس طرح
کونے کونے میں دھما کہ ہو گیا
یہ دھما کہ بس کہ دھما کہ ہے دھما کے کے سوا کچھ بھی نہیں
وہ بھی تو بس ایک دھما کہ تھا' دھما کے کے سوا کچھ بھی نہیں
جس سے اچھلیں کہکشائیں
جس سے ابھری کائنات
گھر سے باہر جب کبھی نکلو دوستو!
کچھ دھما کے بھر لو اپنی جیب میں
ہر گھڑی ہر دم کوئی تازہ دھما کہ دوستو!
کون جانے کوئی ذرہ ٹوٹ جائے

■

ایک لمحہ

زندگی نام ہے کچھ لمحوں کا
اور ان میں بھی وہی اک لمحہ
جس میں دو بولتی آنکھیں
چائے کی پیالی سے جب اٹھیں
تو دل میں ڈوبیں
ڈوب کے دل میں کہیں
آج تم کچھ نہ کہو
آج میں کچھ نہ کہوں
بس یونہی بیٹھے رہو
ہاتھ میں ہاتھ لئے
غم کی سوغات لئے
گرمیٔ جذبات لئے
کون جانے کے اسی لمحے میں
دور پربت پر کہیں
برف پگھلنے ہی لگے

■

زندگی

آج اندھیرا میری نس نس میں اتر جائے گا
آنکھیں بجھ جائیں گی بجھ جائیں گے احساس و شعور
اور یہ صدیوں سے جلتا سا سلگتا سا وجود
اس سے پہلے کہ سحر ماتھے پہ شبنم چھڑکے
اس سے پہلے کہ میری بیٹی کے دو پھول سے ہاتھ
گرم رخسار کو ٹھنڈک بخشیں
اس سے پہلے کہ میرے بیٹے کا مضبوط بدن
تنِ مفلوج میں شکتی بھر دے
اس سے پہلے کہ مری بیوی کے ہونٹ
میرے ہونٹوں کی تپش پی جائیں
راکھ ہو جائے گا جلتے جلتے
اور پھر راکھ بکھر جائے گی
زندگی کہنے کو بے مایہ سہی
غم کا سرمایہ سہی
میں نے ان کے لئے کیا کیا نہ کیا

کبھی آسانی سے اک سانس بھی یمراج کو اپنا نہ دیا
آج سے پہلے بہت پہلے
اسی آنگن میں
دھوپ بھرے دامن میں
میں کھڑا تھا مرے تلوؤں سے دھواں اٹھتا تھا
ایک بے نام سا بے رنگ سا خوف
کچے احساس پہ چھایا تھا کہ جل جاؤں گا
میں پگھل جاؤں گا
اور پگھل کر مرا کمزور سا 'میں'
قطرہ قطرہ مرے ماتھے سے ٹپک جائے گا
رو رہا تھا مگر اشکوں کے بغیر
چیختا تھا مگر آواز نہ تھی
موت لہراتی تھی سو شکلوں میں
میں نے ہر شکل کو گھبرا کے خدا مان لیا
کاٹ کے رکھ دیئے صندل کے پراسرار درخت
اور پتھر سے نکالا شعلہ
اور روشن کیا اپنے سے بڑا ایک الاؤ
جانور ذبح کئے اتنے کہ خوں کی لہریں
پاؤں سے اٹھ کے کمر تک آتیں
اور کمر سے مرے سر تک آتیں
سوم رس میں نے پیا
رات دن رقص کیا
ناچتے ناچتے تلوے مرے خوں دینے لگے
ہڈیاں میری چٹخنے لگیں ایندھن کی طرح
منتر ہونٹوں سے ٹپکنے لگے روغن کی طرح
مرے اعضا کی تھکن

بن گئی کانپتے ہونٹوں پہ بھجن
اگنی ماتا مری اگنی ماتا
سوکھی لکڑی کے یہ بھاری گٹھے
جو تری بھینٹ کو لے آیا ہوں
ان کو سویکار کر اور ایسے دھدھک
کہ مچلتے شعلے
کھینچ لیں جوش میں سورج کی سنہری زلفیں
آگ میں آگ ملے
جوامر کر دے مجھے
ایسا کوئی راگ ملے
اگنی ماں سے بھی نہ جینے کی سند جب پائی
زندگی کے نئے امکان نے لی انگڑائی
دفعتاً دور سے کانوں میں یہ آواز آئی
بدھم شرنم گچھامی
دھمم شرنم گچھامی
سنگھم شرنم گچھامی
چار ابرو کا صفایا کر کے
بے سلے وستر سے ڈھانپا یہ بدن
پوچھ کے پتنی کے ماتھے سے دمکتا بندیا
سوتے بچوں کو بنا پیار کئے
چل پڑا ہاتھ میں کشکول لئے
چاہتا تھا کہ کہیں بھکشا میں جیون مل جائے
جو کبھی بند نہ ہو دل کو وہ دھڑکن مل جائے
مجھ کو بھکشا میں مگر زہر ملا
ہونٹ تھرانے لگے جیسے کرے کوئی گلہ
جھک کے سولی سے اسی وقت کسی نے یہ کہا

ترے اک گال پہ جس پل کوئی تھپڑ مارے
دوسرا گال بھی آگے کر دے
یہی جینے کا طریقہ بھی ہے انداز بھی ہے
تیری آواز بھی ہے، یہ میری آواز بھی ہے
میں اٹھا جس کو اہنسا کا سبق سکھلانے
مجھ کو لٹکا دیا سولی پہ اسی دنیا نے
آ رہا تھا میں کئی کوچوں سے ٹھوکر کھا کر
ایک آواز نے روکا مجھ کو
کسی مینار سے نیچے آ کر
اللہ اکبر اللہ اکبر
ہوا دل کو یہ گماں
کہ یہ پر جوش اذاں
موت سے دے گی اماں
پھر تو پہنچا میں جہاں
میں نے دہرائی کچھ ایسے یہ اذاں
گونج اٹھا سارا جہاں
اللہ اکبر اللہ اکبر
ایسی آواز میں اک اور بھی گونجا اعلان
کل من علیھا فان
اک طرف جھک گیا خورشید جہاں تاب کا سر
ہوا فالج کا اثر
پھٹ گئی نس کوئی
شریانوں میں خوں جم سا گیا
ہوا مجروح دماغ
ایسا لگتا تھا کہ بجھ جائے گا جلتا ہے جو صدیوں سے چراغ
آج اندھیرا مری نس نس میں اتر جائے گا

پھر سمندر جو بڑی دیر سے طوفانی تھا
ایسا تڑپا کہ مرے کمرے کے اندر آیا
آتے آتے وہ مرے واسطے امرت لایا
اور کہا شیو نے یہ بھیجوایا ہے
آج شیو علم ہے، امرت ہے عمل
اب وہ آسان ہے جو دشوار تھا کل
رات جو موت کا پیغام لئے آئی تھی
بیوی بچوں نے مرے اس کو کھڑکی سے پرے
پھینک دیا
اور جو وہ زہر کا اک جام لئے آئی تھی
اس نے وہ خود ہی پیا
صبح اتری جو سمندر میں نہانے کے لئے
رات کی لاش ملی پانی میں

■

تم

شگفتگی کا، لطافت کا شاہکار ہو تم
فقط بہار نہیں حاصل بہار ہو تم
جو ایک پھول میں ہے قید وہ گلستاں ہو
جو اک کلی میں ہے پنہاں وہ لالہ زار ہو تم
حلاوتوں کی تمنا، ملاحتوں کی مراد
غرور کلیوں کا، پھولوں کا انکسار ہو تم
جسے ترنگ میں فطرت نے گنگنایا ہے
وہ بھیرویں ہو، وہ دیپک ہو، وہ ملہار ہو تم
تمہارے جسم میں خوابیدہ ہیں ہزاروں راگ
نگاہ چھیڑتی ہے جس کو وہ ستار ہو تم
جسے اٹھا نہ سکے جستجو وہ موتی ہو
جسے نہ گوندھ سکے آرزو وہ ہار ہو تم
جسے نہ بوجھ سکے عشق وہ پہیلی ہو
جسے سمجھ نہ سکے پیار بھی وہ پیار ہو تم
خدا کرے کسی دامن میں جذب ہو نہ سکیں
یہ میرے اشک حسیں جن سے آشکار ہو تم

■

تصور

یہ کس طرح یاد آ رہی ہو یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو
کہ جیسے سچ مچ نگاہ کے سامنے کھڑی مسکرا رہی ہو

یہ جسم نازک، یہ نرم بانہیں، حسین گردن، سڈول بازو
شگفتہ چہرہ، سلونی رنگت، گھنیرا جوڑا، سیاہ گیسو
نشیلی آنکھیں، رسیلی چتون، دراز پلکیں، مہین ابرو
تمام شوخی، تمام بجلی، تمام مستی، تمام جادو

ہزاروں جادو جگا رہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

گلابی لب، مسکراتے عارض، جبیں کشادہ، بلند قامت
نگاہ میں بجلیوں کی جھل مل، اداؤں میں شبنمی لطافت
دھڑکتا سینہ، مہکتی سانسیں، نوا میں رس، انکھڑیوں میں امرت
ہمہ حلاوت، ہمہ ملاحت، ہمہ ترنم، ہمہ نزاکت

لچک لچک گنگنا رہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

تو کیا مجھے تم منا ہی لوگی گلے سے اپنے لگا ہی لوگی
جو پھول جوڑے سے گر پڑا ہے تڑپ کے اس کو اٹھا ہی لوگی
بھڑکتے شعلوں، کڑکتی بجلی سے میرا خرمن بچا ہی لوگی
گھنیری زلفوں کی چھاؤں میں مسکرا کے مجھ کو چھپا ہی لوگی

کہ آج تک آزما رہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

نہیں محبت کی کوئی قیمت جو کوئی قیمت ادا کروگی
وفا کی فرصت نہ دے گی دنیا ہزار عزم وفا کروگی
مجھے بہلنے دو رنج و غم سے سہارے کب تک دیا کروگی
جنوں کو اتنا نہ گدگداؤ پکڑ لوں دامن تو کیا کروگی

قریب بڑھتی ہی آرہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

■

دو راتیں

الجھے الجھے ہوئے جذبات نہ پوچھو
سہمی سہمی سی عنایات نہ پوچھو
بار بار اس کا کرم فرمانا
چپکے چپکے سرِ بالیں آنا
جانے کیا کیا وہ مجھے سمجھانا
اور پھر آپ ہی شرما جانا
مختصر کتنی تھی وہ رات نہ پوچھو
آہ ممنون اثر ہو کہ نہ ہو
دیکھئے رات بسر ہو کہ نہ ہو
ابر اُمڈے ہوئے، منڈلائے ہوئے
تارے سہمے ہوئے، گھبرائے ہوئے
اشک رخسار پہ کچھ آئے ہوئے
اور کچھ پلکوں پہ تھرائے ہوئے
اب خدا جانے سحر ہو کہ نہ ہو

■

پشیمانی

میں یہ سوچ کر اس کے در سے اٹھا تھا
کہ وہ روک لے گی منالے گی مجھ کو
ہواؤں میں لہراتا آتا تھا دامن
کہ دامن پکڑ کر بٹھا لے گی مجھ کو

قدم ایسے انداز سے اٹھ رہے تھے
کہ آواز دے کر بلا لے گی مجھ کو

مگر اس نے نہ روکا، نہ مجھ کو منایا
نہ دامن ہی پکڑا، نہ مجھ کو بٹھایا
نہ آواز ہی دی، نہ مجھ کو بلایا
میں آہستہ آہستہ بڑھتا ہی آیا
یہاں تک کے اس سے، جدا ہو گیا میں

■

مجبوری

دوست میں دامن بچاتا کس طرح
مجھ سے شان جلوہ فرمائی نہ پوچھ
کس طرح وہ سامنے آئی نہ پوچھ
اس کا حسن اور اس کی رعنائی نہ پوچھ
وہ حجاب آلودہ انگڑائی نہ پوچھ
دل نہ قدموں پر لٹاتا کس طرح

وہ تبسم، وہ ترنم، وہ شباب
وہ نگاہیں وہ ادائیں وہ حجاب
اس کے عارض میں بہکتا ہے گلاب
اس کی آنکھوں سے برستی ہے شراب
پی کے بے خود ہو نہ جاتا کس طرح

اس کے ہونٹوں پر جب آتی ہے ہنسی
پھیل جاتی ہے فضا میں چاندنی
وہ ہے چلتی پھرتی جوہی کی کلی
وہ ہے ہنستی مسکراتی بانسری
گیت الفت کے نہ گاتا کس طرح

ڈھونڈتا تھا حسن اس کا تخت و تاج
مانگتی تھی اس کی رعنائی خراج

سوتنی کا ناز رادھا کا مزاج
چاہتی تھی کرے میرے دل پہ راج
میں بھلا آنکھیں چراتا کس طرح

دل پہ ہنس کر تیر کھانا ہی پڑا
اس کے آگے سر جھکانا ہی پڑا
ہوش مجبوراً گنوانا ہی پڑا
ضبط کا خرمن جلانا ہی پڑا
اور جلاتا تو بجھاتا کس طرح
دوست میں دامن بچاتا کس طرح

■

حوصلہ

تو خورشید ہے بادلوں میں نہ چھپ
تو مہتاب ہے جگمگانا نہ چھوڑ
تو شوخی ہے شوخیء رعائت نہ کر
تو بجلی ہے بجلی جلانا نہ چھوڑ
ابھی عشق نے ہار مانی نہیں
ابھی عشق کو آزمانا نہ چھوڑ

■

چراغاں

ایک دو بھی نہیں چھبیس دیئے
ایک اک کر کے جلائے میں نے
ایک دیا کام کا آزادی کے
اس نے جلتے ہوئے ہونٹوں سے کہا

چاہے جس ملک سے گیہوں مانگو
ہاتھ پھیلانے کی آزادی ہے

اک دیا نام کا خوشحالی کے
اس کے جلتے ہی یہ معلوم ہوا
کتنی بدحالی ہے
پیٹ خالی ہے مرا جیب مری خالی ہے

اک دیا نام کا یکجہتی کے
روشنی اس کی جہاں تک پہنچی
قوم کو لڑتے جھگڑتے دیکھا
ماں کے آنچل میں ہیں جتنے پیوند
سب کو ایک ساتھ ادھڑتے دیکھا

دور سے بیوی نے جھلا کے کہا
تیل مہنگا بھی ہے ملتا بھی نہیں
کیوں دیئے اتنے جلا رکھے ہیں
اپنے گھر میں نہ جھروکہ نہ منڈیر
طاق سپنوں کے سجا رکھے ہیں
آیا غصے کا اک ایسا جھونکا
بجھ گئے سارے دیئے
ہاں مگر اک دیا نام ہے جس کا امید
جھلملاتا ہی چلا جاتا ہے

■

: حکومت اتر پردیش کا ایوارڈ (ایک لاکھ روپے نقد)
: دہلی حکومت (اردو اکادمی) کا مین آف دی ملینیم ایوارڈ (گیارہ لاکھ روپے نقد)
: ہندی اردو ادب ایوارڈ کمیٹی (اتر پردیش) کا ایوارڈ
: ماہنامہ 'آپ کی کائنات' دہلی کی جانب سے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ

: بہترین کہانی کا پریسیڈنٹ ایوارڈ اور
: پدم شری ایوارڈ
(جسے کیفی نے اردو کے ساتھ غیر جمہوری رویے کے خلاف احتجاجاً واپس کر دیا)

■

اندیشے

روح بے چین ہے اک دل کی روایت کیا ہے
دل ہی شعلہ ہے تو یہ سوز محبت کیا ہے
وہ مجھے بھول گئی اس کی شکایت کیا ہے
رنج تو یہ ہے کہ رو رو کے بھلایا ہوگا

وہ کہاں اور کہاں کا ہمِش غم سوزشِ جاں
اس کی رنگین نظر اور نقوشِ حرماں
اس کا احساس لطیف اور شکستِ ارماں
طعنہ زن ایک زمانہ نظر آیا ہوگا

جھک گئی ہوگی جواں سال امنگوں کی جبیں
مٹ گئی ہوگی للک ڈوب گیا ہوگا یقیں
چھا گیا ہوگا دھواں، گھوم گئی ہوگی زمیں
اپنے پہلے ہی گھروندے کو جو ڈھایا ہوگا

دل نے ایسے بھی کچھ افسانے سنائے ہوں گے
اشک آنکھوں نے پئے اور نہ بہائے ہوں گے
بند کمرے میں جو خط میرے جلائے ہوں گے
ایک اک حرف جبیں پر ابھر آیا ہوگا

اس نے گھبرا کے نظر لاکھ بچائی ہوگی
مٹ کے اک نقش نے سو شکل دکھائی ہوگی
میز سے جب میری تصویر ہٹائی ہوگی
ہر طرف مجھ کو تڑپتا ہوا پایا ہوگا

بے محل چھیڑ پہ جذبات ابل آئے ہوں گے
غم پشیمان تبسم میں ڈھل آئے ہوں گے

نام پر میرے جب آنسو نکل آئے ہوں گے
سر نہ کاندھے سے سہیلی کے اٹھایا ہوگا

زلف ضد کرکے کسی نے جو بنائی ہوگی
روٹھے جلووں پہ خزاں اور بھی چھائی ہوگی
برق عشوئی نے کئی دن نہ گرائی ہوگی
رنگ چہرے پہ کئی روز نہ آیا ہوگا

■

احتیاط

اب تم آغوشِ تصور میں بھی آیا نہ کرو
مجھ سے بکھرے ہوئے گیسو نہیں دیکھے جاتے
سرخ آنکھوں کی قسم کانپتی پلکوں کی قسم
تھرتھراتے ہوئے آنسو نہیں دیکھے جاتے

اب تم آغوشِ تصور میں بھی آیا نہ کرو
چھوٹ جانے دو جو دامانِ وفا چھوٹ گیا
کیوں یہ لغزیدہ خرامی یہ پشیماں نظری
تم نے توڑا تو نہیں رشتۂ دل ٹوٹ گیا

اب تم آغوشِ تصور میں بھی آیا نہ کرو
میری آنکھوں سے یہ رخسار نہ کمہلا جائیں
ڈھونڈتی ہوگی تمہیں اس میں نہائی ہوئی رات
جاؤ کلیاں نہ کہیں سیج کی مرجھا جائیں

اب تم آغوشِ تصور میں بھی آیا نہ کرو
میں اس اجڑے ہوئے پہلو میں بٹھا لوں نہ کہیں

لب شیریں کا نمک عارضِ نمکیں کی مٹھاس
اپنے ترسے ہوئے ہونٹوں میں چرا لوں نہ کہیں

اب تم آغوشِ تصور میں بھی آیا نہ کرو
تم کو یہ رسم بھی دنیا نہ نبھانے دے گی
بڑھ کے دامن سے لپٹ جائے گی یوں تازہ بہار
میری آغوشِ تصور میں نہ آنے دے گی

■

نصیحت

زندگی سے گراں جوانی ہے
رحم اپنے پہ کھایئے کیفی
دیکھ کر اب کہیں گھنا سایہ
آپ بھی بیٹھ جایئے کیفی

جذبۂ رحم ابھار دیتا ہے
ہے عجب چیز دورِ عشرت بھی
یاد عہدِ وفا بھی ہے تیرا
یاد رکھوں گا یہ نصیحت بھی

■

آخری مرحلہ

حصار باندھے ہوئے تیوریاں چڑھائے ہوئے
کھڑے ہیں ہند کے سردار سر اٹھائے ہوئے
بڑھے ہیں جھیلے ہوئے قید و بند کے آزار
اٹھے ہیں جنگ خلافت کے آزمائے ہوئے
شجاع حیدر و ٹیپو کی گود کے پالے
دلیر نانک و رنجیت کے سکھائے ہوئے
خمار بادۂ اقبال کی نگاہوں میں
لبوں پہ نغمۂ ٹیگور مسکرائے ہوئے
نفس میں آنچ گرجتی ہوئی مشینوں کی
قدم پہ آتش و آہن کا سر جھکائے ہوئے
جبیں پہ دھان کے کھیتوں کی نرم ہریالی
نظر میں قحط کی پرچھائیاں چھپائے ہوئے
بھڑک کے دوشِ ہوا پر بچھا رہے ہیں کمند
شرر جو سرد کتابوں میں تھے دبائے ہوئے
فضا میں سرخ پھریرا لٹا رہا ہے حیات
ہوا کی زد پہ چراغِ عمل جلائے ہوئے
تڑپ کے گرنے ہی والی ہے برق زنداں پر
کھڑے ہیں در پہ اسیر آسرا لگائے ہوئے

ابھی کھلیں گے نہ پرچم ابھی پڑے گا نہ رن
کہ مشتعل ہے مگر متحد نہیں ہے وطن
پکارتا ہے افق سے لہو شہیدوں کا
کہ ایک ہاتھ سے کھلتی نہیں گلے کی رسن
یہ انتشار، یہ ہلچل، یہ مورچوں میں شگاف
مذاق اڑاتے ہیں عزمِ جہاد کا دشمن

نکل کے صف سے کھڑے ہو گئے ہیں کچھ ساونت
بڑھا کے ہاتھ محبت سے تھام لو دامن
پھر ایک بار بڑھو لے کے صلح کا پیغام
پھر ایک بار جلا دو شکوک کے خرمن
یہ یاس کیوں؟ یہ تمنائے خودکشی کیسی؟
نوید فتح ہے قلبِ عوام کی دھڑکن
مٹا دو مل کے مٹا دو نشاں غلامی کا
زمین چھوڑ چکا کارواں غلامی کا

■

تلاش

(قلعہ احمد نگر جہاں کانگریسی رہنما نظر بند تھے)

یہ بجھی سی شام، یہ سہمی ہوئی پرچھائیاں
خونِ دل بھی اس فضا میں رنگ بھر سکتا نہیں
آ اتر آ کانپتے ہونٹوں پہ اے مایوس آہ
سقفِ زنداں پر کوئی پرواز کر سکتا نہیں
جھلملائے میری پلکوں پر مہ و خور بھی تو کیا؟
اس اندھیرے گھر میں اک تارا اتر سکتا نہیں

لوٹ لی ظلمت نے روئے ہند کی تابندگی
رات کے کاندھے پہ سر رکھ کر ستارے سو گئے
وہ بھیانک آندھیاں، وہ ابتری وہ خلفشار
کارواں بے راہ ہو نکلا، مسافر کھو گئے
ہیں اسی ایوان بے در میں یقیناً رہنما
آ کے کیوں دیوار تک نقشِ قدم گم ہو گئے

دیکھ اے جوشِ عمل وہ سقف یہ دیوار ہے
ایک روزن کھول دینا بھی کوئی دشوار ہے

■

مژدہ

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک؟
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
زوالِ ملت اسلامیہ کے نوحہ خواں شبلی
مبارک ہو کہ کروٹ لے رہا ہے آسماں شبلی
مٹائے گا ہمارا کون اب نام ونشاں شبلی
دھواں گرما چکا اڑنے کو ہیں چنگاریاں شبلی

پریشاں ہوگئے شیرازۂ اوراقِ اسلامی
چلیں گی تند باد کفر کی یہ آندھیاں کب تک؟
یقیناً موت کا پیغام ہے تنظیم کی خامی
جگا بھی تو دیا کرتا ہے اکثر درد ناکامی
اکٹھا ہو رہے ہیں منتشر اوراقِ اسلامی
چھپے گی قصرِ سلطانی میں اب یہ آندھیاں شبلی

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ حشر انگیزیاں تا کے یہ ظلم آرائیاں کب تک
ہمارے خوں سے دامانِ گلستاں ہو چلا رنگیں
خزاں کے دام میں جکڑے پڑے ہیں سنگ دل گلچیں
خوشا تہذیب انسانی کے استادو کو لے ڈوبیں
وہ حشر انگیزیاں شبلی وہ ظلم آرائیاں شبلی

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک

لیا ہے یہ سبق ہم نے خود اپنے خوں شدہ دل سے
ستم کی خو بدل سکتی نہیں فریاد بسمل سے
تڑپ کر چھین لیں گے تیغ اب دست قاتل سے
ہماری گردنوں پر اب نہ ہوگا امتحاں شبلی

یہ مانا گرمیٔ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو
دکھائیں ہم مگر ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک"
افق پر کروٹیں لینے لگا جمہور کا پرچم
نئے سانچے میں ڈھلتا جا رہا ہے عرصۂ عالم
ہمارے ہمہموں سے جن کی محفل ہو چلی برہم
وہ کیا دیکھیں گے اب ہنگامۂ آہ و فغاں شبلی

یہ مانا قصۂ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے
سنائیں اپنے درد دل کی تم کو داستاں کب تک
وہ گل شعلہ بنے ہیں پرستم کروٹ بدلتا تھا
وہ رات آخر ہوئی جس میں چراغ ظلم جلتا تھا
ہمارا قصہ غم سن کے جن کا جی بہلتا تھا
قریبِ ختم آ پہنچی انہیں کی داستاں شبلی

■

نئے خاکے

(گاندھی جناح ملاقات کے موقع پر)

نقوشِ حسرت مٹا کے اٹھنا' خوشی کا پرچم اڑا کے اٹھنا
ملا کے سر بیٹھنا مبارک ترانۂ فتح گا کے اٹھنا
یہ گفتگو گفتگو نہیں ہے' بگڑنے بننے کا مرحلہ ہے
دھڑک رہا ہے فضا کا سینہ کہ زندگی کا معاملہ ہے

خزاں رہے یا بہار آئے تمہارے ہاتھوں میں فیصلہ ہے
نہ چین بے تاب بجلیوں کو نہ مطمئن کاروانِ شبنم
کبھی شگوفوں کے گرم تیور کبھی گلوں کا مزاج برہم
شگوفہ و گل کے اس تصادم میں گلستاں بن گیا جہنم

سجا لیں سب اپنی اپنی جنت اب ایسے خاکے بنا کے اٹھنا

خزانۂ رنگ و نور تاریک رہ گذاروں میں لٹ رہا ہے
عروسِ گل غرورِ عصمت سیاہ کاروں میں لٹ رہا ہے
تمام سرمایۂ لطافت ذلیل خاروں میں لٹ رہا ہے
گھٹی گھٹی ہیں نمو کی سانسیں چھٹی چھٹی نبضِ گلستاں ہے
ہیں گرسنہ پھول، تشنہ غنچے رخوں پہ زردی لبوں پہ جاں ہے
اسیر ہیں ہم سفیر جب سے خزاں چمن میں رواں دواں ہے

اس انتشارِ چمن کی سوگند باب زنداں ہلا کے اٹھنا

حیاتِ گیتی کی آج بدلی ہوئی نگاہیں ہیں انقلابی
افق سے کرنیں اتر رہی ہیں بکھیرتی نور کامیابی
نئی سحر چاہتی ہے خوابوں کی بزم میں اذنِ باریابی
یہ تیرگی کا ہجوم کب تک یہ یاس کا ازدہام کب تک
نفاق و غفلت کی آڑ لے کر جئے گا مردہ نظام کب تک
رہیں گے ہندی اسیر کب تک رہے گا بھارت غلام کب تک

گلے کا طوق آرہے قدم پر کچھ اس طرح تلملا کے اٹھنا

■

کرن

(گاندھی جناح ملاقات)

مطمئن کوئی نفس اے دل رنجور نہیں
اب الگ بیٹھ کے جی لینے کا مقدور نہیں
تجربوں نے وہ لگائے ہیں دلوں میں چرکے
روٹھے مل جائیں گلے آج تو کچھ دور نہیں
زندگی صلح پہ مجبور ہوئی جاتی ہے

رخ سم آلود ہواؤں کا بدلنے سا لگا
شوق پژمردہ عناصر میں مچلنے سا لگا
کس نے یہ ساز اخوت پہ الاپا دیپک
اک دیا رات کی آغوش میں جلنے سا لگا
تیرگی یاس کی کافور ہوئی جاتی ہے

خار کیا چیز ہے دو دوست جو ملنا چاہیں
سوز رفتار سے لو دینے لگی ہیں راہیں
وقت نے سینہ احساس میں لے لی چٹکی
ڈال دیں گرم تقاضوں نے گلے میں بانہیں
آخری شرط بھی منظور ہوئی جاتی ہے

مل گئیں اٹھ کے نگاہیں جو نگہبانوں کی
نبض ابھر آئی سسکتے ہوئے ارمانوں کی
ناخدا جوڑ کے سر بیٹھنے والے ہیں ادھر
اور ادھر سانس اکھڑنے لگی طوفانوں کی
موج کشتی کے تلے چور ہوئی جاتی ہے

■

نئی جنت

نئے ہندوستاں میں ہم نئی جنت بسائیں گے
تڑپ دے کر خس و خاشاک کو بجلی بنائیں گے
کوئی آواز دے دے آتش فشاں چاند تاروں کو
کہ اب خاک وطن کے جھلسے ذرے جگمگائیں گے
اداسی مسکرائے گی بیاباں لہلہائیں گے
نئے ہندوستاں میں ہم نئی جنت بسائیں گے

الٹ کر ایک ٹھوکر میں ستم کا راج رکھ دیں گے
اٹھا کر اپنی بستی کو سر معراج رکھ دیں گے
وہ اک گل کی حکومت کی کہ گلشن لٹ گیا سارا
ہم اب کے غنچے غنچے کی جبیں پر تاج رکھ دیں گے
ہم اب کی تنکے تنکے کو چمن بندی سکھائیں گے
نئے ہندوستاں میں ہم نئی جنت بسائیں گے

وفور جستجو میں کیسے اپنے کیسے بیگانے
گتھے رہتے ہیں باہم شمع آزادی کے پروانے
گرہ لگنے سے اکثر رشتۂ دل ٹوٹ جاتا ہے
الگ ہو کر رہیں گے متحد تسبیح کے دانے
شکنجے توڑ دو متوالے ہنس کر مل ہی جائیں گے
نئے ہندوستاں میں ہم نئی جنت بسائیں گے

اٹھایا زندگی نے گنگنا کر وہ رباب اپنا
حقیقت سے گلے ملنے کو ہے رنگین خواب اپنا
یہ رنگ آلودہ مہریں جلد اے پیر مغاں لے جا
خم اپنے ہوں گے ساغر اپنے ذوق انتخاب اپنا
جنہیں چاہیں گے ان کو میر میخانہ بنائیں گے
نئے ہندوستان میں ہم نئی جنت بسائیں گے

■

احوال

کیفی اعظمی کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے تھا۔ وہ بچپن ہی سے بے حد حساس اور دردمند دل کے مالک رہے، یہی وجہ ہے کہ وہ آج بھی انسان دوستی کے جذبے سے سرشار نظر آتے ہیں۔ اس عہد میں شیعہ گھرانوں کا ماحول عام طور سے شعروادب سے گہرا تعلق رکھتا تھا۔ مجلسوں کی محفلیں آراستہ ہوا کرتی تھیں، لہٰذا ایسے ماحول میں پروان چڑھنے والے بچوں کی طبیعت موزوں ہو جایا کرتی تھی اور یہ موزونیت زندگی کی آخری منزل تک اس پر غالب رہتی۔

کیفی کا گھرانہ بھی ایسا ہی تھا۔ چنانچہ گیارہ سال کی عمر میں انہوں نے شعروشاعری کی ابتداء کی اور اپنے گھر کی ایک نشست میں بڑے بھائی کی اجازت سے ایک غزل سنائی۔ غزل نے مشاعرہ لوٹ لیا، بے انتہا داد ملی۔ ان کے والد کو یقین نہ تھا کہ یہ غزل کیفی کی ہے اور جب ان کے والد نے مشکوک نگاہوں سے انہیں دیکھا، تو وہ خوب روئے اور بڑے عزم کے ساتھ اپنی بہن واجدہ سے کہا کہ ایک دن میں ہندوستان کا بڑا شاعر بنوں گا، اور آج یقیناً وہ افق شاعری پر ایک تابندہ ستارے کی مانند نہایت تابناکی کے ساتھ روشن ہیں۔ ان کے والد کا شبہ اس مصرعہ طرح پر غزل کہنے کے بعد ہی ختم ہوا:

'اتنا تو زندگی میں کسی کی خلل پڑے'

اس مصرعہ پر غزل کہنے کے بعد کیفی نے باضابطہ شعروشاعری کی دنیا میں قدم رکھا اور اس کے بعد پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ غزل آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

اتنا تو زندگی میں کسی کی خلل پڑے
ہنسنے سے ہو سکون نہ رونے سے کل پڑے

جس طرح ہنس رہا ہوں پی پی کے اشکِ غم
یوں دوسرا ہنسے تو کلیجہ نکل پڑے

نئے مہربان

بے سمجھے دل کا حال ترس کھا رہے ہیں آپ
کس درجہ مہربان نظر آرہے ہیں آپ

ہم بدنصیب قدرِ کرم جانتے نہیں
دعویٰ بغیر جہدوعمل مانتے نہیں
اس اہتمامِ راہ نمائی کا شکریہ
ہم تو مگر حضور کو پہچانتے نہیں
کس انجمن سے اٹھ کے چلے آرہے ہیں آپ

اب تک کہاں تھے آپ نگاہیں ملائیے
بند نقاب کھولئے صورت دکھائیے
آنکھوں میں نور چہرے پہ سکوں کی چاندنی
یہ کس کا خوں ہے کس کا اجالا بتائیے
جلوہ دکھاکے ہم سے چھپے جا رہے ہیں آپ

ہے ذوق دید کب سے اسی پیچ و تاب میں
خورشید ہے کہ برق چھپی ہے نقاب میں
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
کیا چیز اتنے پیار سے چھلکا رہے ہیں آپ

ماضی کے تجربوں کو بھلایا نہ جائے گا
ہم سے فریب جان کے کھایا نہ جائے گا
ہو جائے اپنی گرد میں گم قافلہ جہاں
اس سمت اک قدم بھی اٹھایا نہ جائے گا
کس راستے پر ہم کو لئے جا رہے ہیں آپ

طوفاں بھی جھوم جھوم کے آندھی بھی آئی ہے
اک شمع کتنے جھونکوں سے ہم نے بچائی ہے
وہ ابتری وہ بے سروپائی وہ خلفشار
سو مشکلوں کے بعد ابھی صف جمائی ہے
پھر انتشار بزم میں پھیلا رہے ہیں آپ

ذوقِ عمل ہی جاگ گیا ہے تو آیئے
یہ ساز انقلاب ہے کچھ گنگنایئے
کاندھے پہ رکھ کے سرخ علم آن بان سے
ہر سمت اتحاد کا پرچم اڑایئے
کیوں راہ سخت دیکھ کے کترا رہے ہیں آپ

بے چارگی زیست پہ ہے موت خندہ زن
روٹی تو کیا غریبوں کو ملتا نہیں کفن
بکتے ہیں جسم ہوتی ہیں نیلام عصمتیں
پھرتی ہے بال کھولے ہوئے غیرتِ وطن
اٹھیے کہ بس ہمیں پہ ترس کھا رہے ہیں آپ

اس وقت بھی جو خوئے نفاق آپ چھوڑتے
مل جل کے آفتوں کی کلائی مروڑتے
لاتے انہیں منا کے جو روٹھے ہیں دیر سے
ٹوٹے ہوئے دلوں کو محبت سے جوڑتے
جھلا کے اور شیشوں کو ٹکرا رہے ہیں آپ

■

سپردگی

اے کہ تم دردِ غلامی کی دوا بھول گئے
کھا کے دلّی کی ہوا عہدِ وفا بھول گئے
دوست سے روٹھ کے غیروں کی جفا بھول گئے
باہمی جنگ میں دشمن کا گلا بھول گئے
اتنا ٹکرائے ہو آپس میں کہ خود کانپتے ہو
یونین جیک کے سائے میں کھڑے ہانپتے ہو

یاد تو ہوگا تمہیں بھی وہ غلامانہ چلن
گھر کے جھگڑوں میں رہا کرتے تھے تم دونوں مگن
آ گیا عین لڑائی میں جو لندن سے مشن
شملہ رو ہو کے جھکادی گئی آخر گردن
در دیولؔ پہ ہرؔی اور غنؔی ایک ہوئے
اس کے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

وہی فوجیں، وہی سنگینیں، وہی شمشیریں
وہی فرمان، وہی جور، وہی تعزیریں
وہی جلّاد وہی دار وہی زنجیریں
تم نے آزادی کی دیکھی ہیں کدھر تصویریں
زخم سینے کا ہنسی میں نہ چھپاؤ ہم سے
رہبرو آج نگاہیں تو ملاؤ ہم سے

مادرِ ہند کے ہونٹوں پہ فغاں ہے کہ نہیں
روئے ملت پہ غلامی کا دھواں ہے کہ نہیں
روح کو آج بھی احساسِ زیاں ہے کہ نہیں
پاؤں میں آج بھی زنجیر گراں ہے کہ نہیں
جہد و قربانی و ایثار کا حاصل ہے یہی
کیا جہاں دوڑ کے تم بیٹھے، ہو منزل ہے یہی؟

تم نے سرسامنے دشمن کے جھکایا کیسے؟
اپنے جے کاروں کو نعروں کو بھلایا کیسے؟
فتح کا تاج لٹیروں کو پہنایا کیسے؟
بڑھ کے جلاّد کو سینے سے لگایا کیسے؟
جبریہ صلح پہ کہنا تھا بہر طور نہیں
تم نمائندے ہمارے ہو کوئی اور نہیں

جنبشِ لب در دشمن پہ صدا کی توہین
غیر سے دوست کی فریاد وفا کی توہین
تکیہ ابلیس پہ عرفانِ خدا کی توہین
منجمد خون میں شعلے سے تپاں ہیں دیکھو
افقِ دار سے لاشیں نگراں ہیں دیکھو

جاؤ چٹ گاؤں کے جاں باز گنہگار سہی
ویر پنجاب کے بنگال کے بدکار سہی
تھا بھگت سنگھ خطاوار خطاوار سہی
لال کپور کے غدار تھے غدار سہی
موپلا سے تو کبھی شکوۂ بیدار سنو
سن بیالیس کے کشتوں کی تو فریاد سنو

اشک لو دینے لگے رقص شرر سے پہلے
آگ دوڑی رگِ احساس پہ گھر سے پہلے
تھی ہمیں فکر رفو زخمِ جگر سے پہلے
چونک چونک اٹھے ہیں ہم آثارِ سحر سے پہلے
خواب پر بھی اثرِ سلسلۂ خواب نہیں
اپنی تاریخ میں غفلت کا کوئی باب نہیں

ذکر ماضی نہ سنو حال کے تیور دیکھو
کوندتے ہیں خس و خاشاک میں خنجر دیکھو

ہاں نہتوں سے کبھی آنکھ ملا کر دیکھو
ایک اک شیر ہے بپھرا ہوا لشکر دیکھو
تم رہے جاتے ہو پیچھے وہ بڑھے جاتے ہیں
نوجواں موت کے سینے پہ چڑھے جاتے ہیں

آگ کشمیر کے سینے میں بھڑکتی ہے اٹھو
ساحلِ ہند پہ برق اب بھی کڑکتی ہے اٹھو
روح زندانِ غلامی میں پھڑکتی ہے اٹھو
چھاتی ہر فیکٹری کی آج دھڑکتی ہے اٹھو
ذرے ذرے میں ہے بے تاب شرارے لاکھوں
صفِ دشمن میں بھی ہیں دوست تمہارے لاکھوں

آج اس بار غلامی سے بہت چور ہیں سب
بھوک سے پیاس سے آزار سے رنجور ہیں سب
جان دے دینے پہ لڑ جانے پہ مجبور ہیں سب
پھونک دو صور کہ اب منتظر صور ہیں سب
ایک جھٹکے میں فقط طوق اتر جائے گا
ورنہ ٹھکرا کے تمہیں وقت گذر جائے گا

■

قومی حکمراں

یہ جانتا ہوں کہ حکمرانی کی ساری رسمیں ادا کروگے
ستم کو انصاف، ظلم کو مصلحت کا تمغہ عطا کروگے

سیا بڑی شان سے حکومت کا دامن تار تار تم نے
اٹھا لیا اپنے سر پہ برطانیہ کے کاندھے کا بار تم نے
بڑھا دیا آنکھ بند کرکے پولس کا اقتدار تم نے
پہنا دیا نفع خوروں، چوروں کو دیش بھگتی کا ہار تم نے

مگر غریبوں سے جو کئے ہیں وہ وعدے کب تک وفا کروگے
خود اپنے ہاتھوں سے بڑھنے والوں کو طوق بیڑی پہنا رہے ہو
جیل خانے اجڑ چلے تھے تم ان کی رونق بڑھا رہے ہو
غریب محنت کشوں کے ہر مورچے کو ہنس ہنس کے ڈھا رہے ہو
لہو کسانوں کا چپہ چپہ زمیں کی خاطر بہا رہے ہو
معاوضہ اور کیا زمینوں کے غاصبوں کو ادا کروگے
سہے گا بھارت ستم کہاں تک عوام اٹھائیں گے ناز کب تک
گلا دبا دے گا حریت کا تمہارا دست دراز کب تک
سبھاؤں کو توڑنے کچلنے کی ہوگی یہ ساز باز کب تک
اڑیں گے بپھری فضا میں لے کر تمہیں ہوائی جہاز کب تک
کبھی تو آخر زمین کے ساکنوں کا بھی سامنا کروگے

یہ کیسے حیلے ہیں جن میں ویٹو کی جعلسازی جھلک رہی ہے
یہ کیسا لہجہ ہے جس میں سنگھانیا کی چاندی کھنک رہی ہے
اٹھی ہے کھیتوں سے سرخ آندھی ملوں میں بجلی چمک رہی ہے
تمہارا منہ مادر وطن آج کتنی حسرت سے تک رہی ہے
جو کہہ چکے ہو وہ کر دکھاؤ سہارے کب تک دیا کروگے

غضب کا بھونچال ہے پرانے محل سے باہر نکل بھی آؤ
یہ میہماں راہزن سے بدتر تھے ان پہ اتنا ترس نہ کھاؤ
اکھڑ چکے پاؤں جس کے اس فوج کی نہ ٹوٹی صفیں جماؤ
بھڑک چکی آتش بغاوت اسے نہ گھبرا کے اب بجھاؤ
کہیں لپک کر تمہارا دامن پکڑ لیں شعلے تو کیا کروگے

■

عورت

اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے
قلب ماحول میں لرزاں شرر جنگ ہیں آج
حوصلے وقت کے اور زیست کے یک رنگ ہیں آج
آبگینوں میں تپاں ولولۂ سنگ ہیں آج
حسن اور عشق ہم آواز و ہم آہنگ ہیں آج

جس میں جلتا ہوں اسی آگ میں جلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبضِ ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں
اڑنے کھلنے میں ہے نکہت خم گیسو میں نہیں
جنت اک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں

اس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

گوشے گوشے میں سلگتی ہے چتا تیرے لئے
فرض کا بھیس بدلتی ہے قضا تیرے لئے
قبر ہے تیری ہر اک نرم ادا تیرے لئے
زہر ہی زہر ہے دنیا کی ہوا تیرے لئے

رت بدل ڈال اگر پھولنا پھلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

قدر اب تک تری تاریخ نے جانی ہی نہیں
تجھ میں شعلے بھی ہیں بس اشک فشانی ہی نہیں
تو حقیقت بھی ہے دلچسپ کہانی ہی نہیں
تیری ہستی بھی ہے اک چیز جوانی ہی نہیں

اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

توڑ کر رسم کے بت بند قدامت سے نکل
ضعف عشرت سے نکل وہم نزاکت سے نکل
نفس کے کھینچے ہوئے حلقۂ عظمت سے نکل
قید بن جائے محبت تو محبت سے نکل

راہ کا خار ہی کیا گل بھی کچلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

توڑ یہ عزم شکن دغدغۂ پند بھی توڑ
تیری خاطر ہے جو زنجیر وہ سوگندھ بھی توڑ
طوق یہ بھی ہے زمرد کا گلوبند بھی توڑ
توڑ پیمانۂ مردانِ خردمند بھی توڑ

بن کے طوفان چھلکنا ہے ابلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

تو فلاطون و ارسطو ہے تو زہرا پروین
تیرے قبضے میں ہے گردوں تری ٹھوکر میں زمیں
ہاں اٹھا جلد اٹھا پائے مقدر سے جبیں
میں بھی رکنے کا نہیں وقت بھی رکنے کا نہیں

لڑکھڑائے گی کہاں تک کہ سنبھلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

■

ماحول

طبیعت جبر یہ تسکین سے گھبرائی جاتی ہے
ہنسوں کیسے ہنسی کمبخت تو مرجھائی جاتی ہے

بہت چمکا رہا ہوں خال وخد کو سعیٔ رنگیں سے
مگر پژمردگی سی خال و خد پر چھائی جاتی ہے

امیدوں کا اجالا خوب برسا شیشۂ دل پر
مگر جو گرد تھی تہہ میں وہ اب تک پائی جاتی ہے

جوانی چھیڑتی ہے لاکھ خوابیدہ تمنا کو
تمنا ہے کہ اس کو نیند ہی سی آئی جاتی ہے

محبت کی نگوں ساری سے دل ڈوبا سا رہتا ہے
محبت دل کے اضمحلال سے شرمائی جاتی ہے

فضا کا سوگ اتر آرہا ہے ظرف ہستی میں
نگاہ شوق روح آرزو کجلائی جاتی ہے

یہ رنگ مے نہیں ساقی جھلک ہے خوں شدہ دل کی
جو اک دھندلی سی سرخی انکھڑیوں میں پائی جاتی ہے

■

دستور بخشش

لبالب ہیں کہیں ساغر کہیں خالی پیالے ہیں
یہ کیسا دور ہے ساقی یہ کیا تقسیم ہے ساقی

نہیں پہچانتا تیور ابھی تو تشنہ کاموں کے
ترا دستور بخشش لائقِ ترمیم ہے ساقی

■

تاج

ہاں یہی تاج اسی تاج زر افشاں کی قسم
حلقۂ جبر ہے محکومیٔ انساں کی قسم

شر کا عنوان ہے یہ جنگ کی تمہید ہے یہ
تیرگی جس سے برستی ہے وہ خورشید ہے یہ

چھو کے جب اس کو ہوا جھومتی بل کھاتی ہے
خود بخود آگ ہر اک سمت بھڑک جاتی ہے

مرگ مے خانہ ہے گو رونق مے خانہ ہے
زہر ہی زہر ہے جس میں یہ وہ پیمانہ ہے

اس کا سایا جو کوئی شکل بنا دیتا ہے
اٹھ کے چنگیز زمانے کو ہلا دیتا ہے

سست ہے نبض بقا زرد ہے روئے توحید
کہ اس آغوش میں خوابیدہ ہیں فرعون و یزید

اف یہ تاریک چمک، اف یہ بھیانک تنویر
عکس ڈالے ہوئے ہے زار کا منحوس ضمیر

نسل و مذہب کا یہ رہتا نہیں پابند کبھی
فرق یہ جس کے چمک جائے ہلاکو ہے وہی

چھوٹ اس کی تن آہن پہ جو پڑ جاتی ہے
آگ اگلتی ہوئی شمشیر ابھر آتی ہے

اس کی رونق نے اجاڑے ہیں گلستاں لاکھوں
اس نے بستی میں بسائے ہیں بیاباں لاکھوں

اک تم کہ تم کو فکر نشیب و فراز ہے
اک ہم کہ چل پڑے تو بہرحال چل پڑے

ساقی سبھی کو ہے غم تشنہ لبی مگر
مئے ہے اسی کے نام پہ جس کے ابل پڑے

مدت کے بعد اُس نے جو کی لطف کی نگاہ
جی خوش تو ہو گیا مگر آنسو نکل پڑے

کیفی کی اس زمانے میں بہت ساری غزلیں ضائع ہوگئیں، مگر اس غزل کو بیگم اختر نے اپنی آواز سے زندہ رکھا اور یہ غزل ہند و پاک میں بہت مشہور ہوئی۔ مذکورہ غزل کا یہ شعر جسے کیفی نے پہلی بار مشاعرے میں ایک شاعر کی حیثیت سے مانی صاحب کے سامنے پڑھا تھا اور بے انتہا داد و تحسین کے باوجود مشکوک نگاہوں سے دیکھے گئے تھے شعر یوں ہے:

وہ سب کی سن رہے ہیں سب کو دادِ شوق دیتے ہیں
کہیں ایسے میں میرا قصۂ غم بھی بیاں ہوتا

مصرعہ طرح پر غزل کہنے کے بعد ان کے والد نے ان کو پار کر قلم، سرج کی شیروانی کے ساتھ ایک تخلص بھی دیا 'کیفی'۔ شروع میں وہ ترنم سے مشاعرہ پڑھا کرتے تھے، شاید اسی لئے وہ جس داد کے مستحق تھے وہ انہیں نہیں ملتی۔ سروجنی نائیڈو اس بات کو محسوس کر رہی تھیں کہ کیفی اگر ترنم سے پڑھنا چھوڑ دیں تو مشاعرے میں زیادہ کامیاب رہیں گے، لہٰذا ایک دن سروجنی نائیڈو نے ان کی آواز ٹیپ کر کے انہیں سنایا اور یہ مشورہ دیا کہ وہ تحت اللفظ ہی پڑھا کریں۔ اس کے بعد وہ ایک مخصوص انداز میں مشاعرہ پڑھنے لگے اور مشہور ہونے لگے۔

سلطان المدارس لکھنؤ کے تعلیمی زمانے میں سب سے پہلے اردو حلقے میں ان کی ملاقات علی عباس حسینی سے ہوئی تھی۔ مدرسہ کی پہلی ہڑتال کیفی کی رہنمائی میں ہوئی تھی اور ہر روز مدرسہ کے ارباب حل و عقد کے خلاف وہ نظم پڑھتے اور مجمع ان کی نظموں کو سنتا۔ ایک دن علی عباس حسینی کا گذر اس طرف سے ہوا، تو تانگے سے اتر کر دیر تک ان کی نظمیں سنتے رہے اور پھر اپنے ساتھ ان کو اپنے گھر لے گئے، جہاں ان کی ملاقات 'سرفراز' کے ایڈیٹر سید اعظم حسین اور اردو کے مشہور نقاد پروفیسر احتشام حسین سے ہوئی۔ 'سرفراز' لکھنؤ میں ہی کیفی کی پہلی نظم شائع ہوئی تھی۔ روس کی حمایت میں وہ نظمیں لکھ کر 'قومی جنگ' کو بھیجتے مگر نظم میں کوئی نام اور پتہ نہیں لکھتے۔ پی سی جوشی، سجاد ظہیر اور علی سردار جعفری نظمیں پڑھ کر حیران

کانیں چھانی ہیں پہاڑوں کے ورق موڑے ہیں
ایک ہیرے کے لئے لاکھ جگر توڑے ہیں

گھر تو گھر شمع مزاروں کی بھی بجھ جاتی ہے
جب کہیں اس کے نگینوں میں چمک آتی ہے

سیم و زر اس کے لئے لاکھ اگلتی ہے زمیں
یہ وہ کشکول گدائی ہے کہ بھرتا ہی نہیں

صدق کو کذب سکھاتی ہے حکومت اس کی
علم کو جہل بناتی ہے سیاست اس کی

یہ وہ جادو ہے کہ ایمان پہ بھی چلتا ہے
حسبِ منشا اسی سانچے میں خدا ڈھلتا ہے

خونِ حق آ کے اس جام میں بنتا ہے شراب
جانکنی رقص کا پاجاتی ہے رنگین خطاب

اس کا طرۂ جو کبھی غیظ میں بل کھاتا ہے
زہر سقراط کے ڈھانچے میں چھنک جاتا ہے

زندگی اٹھی ہے زور اس کا مٹانے کے لئے
اور بڑھتا ہے کوئی ضرب لگانے کے لئے

■

Kaifi Azmi

25, Janki Kutir, Juhu, Bombay - 400 049. Phone : 614 46 83.

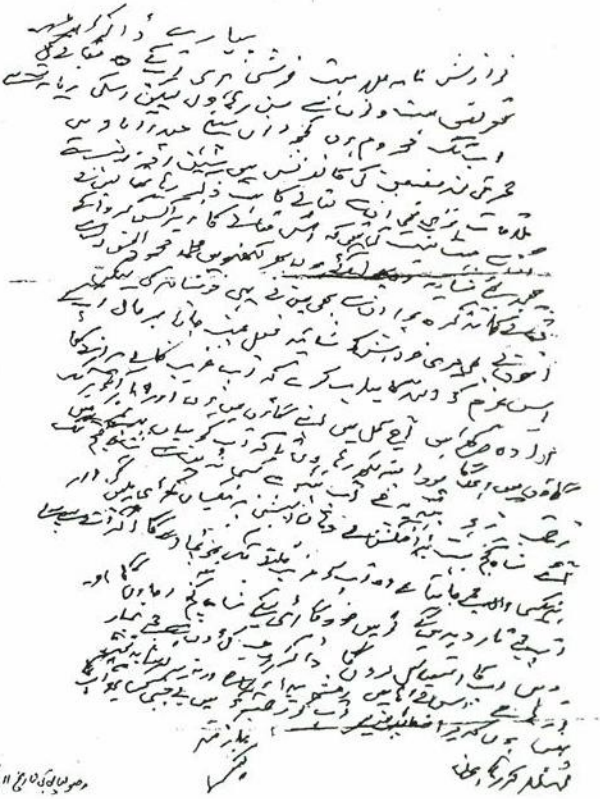

کیفی

مجواں

۲۳ جنوری

[illegible] آپ کا ۲۰ جنوری کا

خط ملا [illegible] پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ میری شاعری پر

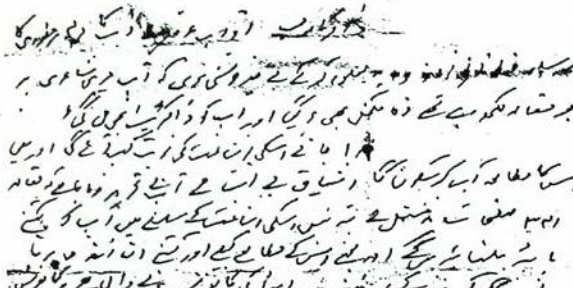

جو مقالہ لکھ رہے تھے وہ مکمل بھی ہو گیا اور اب آپ کو ڈاکٹریٹ مل جائے گی

[illegible] اسکی اشاعت کی راہ تکتا رہوں گا اور میں

اسکا مطالعہ بڑی دلچسپی سے کروں گا [illegible]

[illegible] اسکی اشاعت کے سلسلے میں آپ کو [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

خلوص کے ساتھ

کیفی

رانچی میں منعقدہ ۱۶-۱۷ فروری' ۱۹۹۱ء کو فرقہ پرستی کے خلاف کل ہند کانفرنس' ریلی اور مشاعرہ میں (بائیں سے) کیفی اعظمی' انور ایرج' پروفیسر قمر رئیس' پروفیسر وہاب اشرفی' پروفیسر ابوذرعثمانی' غلام ربانی تاباں' ندافاضلی و دیگر شعراء

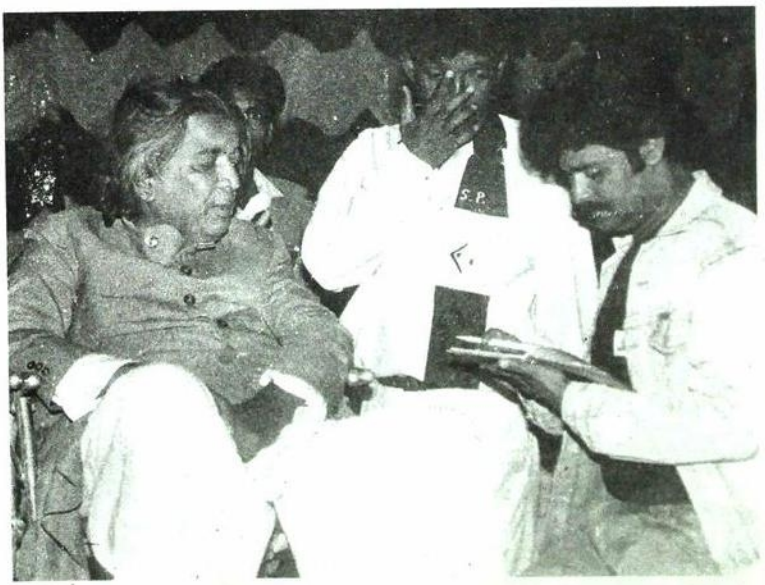

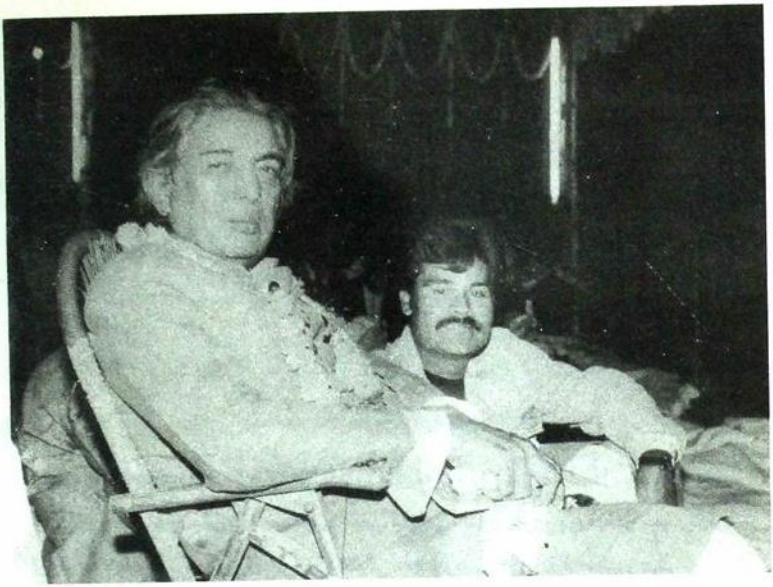

S.P.

ایک ایسے حالات میں جب ہندوستان پر بپتا پڑی ہو اور پورا ہندوستان جل رہا ہو، ہر طرف افراتفری، قتل و غارت گری، وحشت کا ننگا ناچ، تباہی و بربادی، مقدر میں لکھ دی گئی ہو، ہر آدمی ڈرا اور سہا ہوا ایک دوسرے سے بے حد خائف ہو، ایسے حالات میں کیا ادب کا تقاضا صرف فنی لوازمات کو پورا کرنا، ذات کے خول میں بند ہو کر نوحہ کناں ہونا، خیالی لیلاؤں کا سراپا بیان کرنا، عین ادب ہے۔ تو ایسے مردہ ادب اور مردار ادیب سے عوام کا کیا واسطہ، مسلکِ عوام میں دونوں حرام ہیں۔

ادب کے نام پر عوام سے دھوکا دھڑی کے الزام میں ایسے ادیبوں کو جنہوں نے عوام کو گمراہ کیا، زندگی کے تلخ حقائق سے چشم پوشی کی اور گرد و پیش کے حالات سے عوام کو روبرو کرنے کے بجائے فرار کی ترغیب دی، انہیں تعزیرات فن کے تحت ادب کی رو سے نو دو گیارہ ہونے کے الزام میں ہماری عوامی تنقید انہیں سزائے موت کا حکم سنا چکی ہے۔

© جملہ حقوق بنام رضیہ سلطانہ محفوظ

دار و رسن

کیفی اعظمی کی شاعری

مصنف : انور ایرج
اشاعت : اکتوبر ۲۰۰۳ء
کمپوزنگ : محمد اصغر، گیلیکسی کمپیوٹر، پٹنہ سیٹی-۸
کور ڈیزائین : عمیر انور
ناشر : جرس پبلیکیشن، پٹنہ / جھارکھنڈ
طباعت : گیلیکسی آفسیٹ، پٹنہ
قیمت : ۲۰۰ روپے
ملنے کا پتہ : ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ
تاج بک ڈپو، مین روڈ، رانچی
پتہ : شعبۂ اردو ڈی۔ایس کالج، کٹیہار فون : 06452-22372
مستقل پتہ : مدینہ منزل، لیک فیکٹری روڈ، ہندپیڑھی، رانچی-۸۳۴۰۰۱ (جھارکھنڈ)
موجودہ پتہ : کیئر آف، تقی امام، چودھری ہوٹل لین، پوسٹ بی وی کالج، سمرہ، بورہ، راجا بازار، پٹنہ-۱۴

**یہ کتاب محکمۂ راج بھاشا، اردو ڈائرکٹوریٹ،
حکومت بہار کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے**

DAAR-O-RASAN

Kaifi Aazmi Ki Shairi

Author : Dr. Anwar Eraj

Rs. 200/-

ہوتے کہ آخر یہ شخص کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ اور اپنا نام پتہ کیوں نہیں لکھتا۔ ان کی نظموں کی وجہ سے ان کی تلاش شروع ہوگئی اور ایک دن مشاعرے میں ہی سردار نے کیفی کو پہچان لیا۔ سجاد ظہیر کی خواہش پر کیفی سردار جعفری کے ساتھ بمبئی پہنچے۔ پی سی جوشی اور پارٹی والوں نے ان کا زبردست استقبال کیا اور انہیں پارٹی کا ممبر بنالیا۔ ۱۹۴۳ء میں ہی وہ پارٹی کے ممبر ہوگئے۔ اس وقت ان کی تنخواہ ۴۵ روپے مقرر ہوئی اور اس کے بعد سے پارٹی کے اخبار کے پہلے صفحے پر ان کی نظم شائع ہونے لگی۔

۱۹۴۷ء میں حیدرآباد کے ایک مشاعرے میں ان کی شرکت ہوئی اس مشاعرے میں ان کی زندگی نے ایک نیا موڑ لیا۔ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے ہی سامعین سے ہال بھر چکا تھا۔ پہلی صف میں ایک دبلی پتلی خوبصورت سی لڑکی اپنے بڑے بھائی خورشید علی خاں اور بہنوئی اختر حسین کے ساتھ بیٹھی ان کی گرج دار آواز سن کر مبہوت تھی کہ آخر یہ کون ہے جو نظام سرکار کے راج میں بے خوف ہوکر اس کے خلاف اپنی نظم (تاج) سنا رہا ہے۔ مشاعرے کے بعد لڑکیوں نے انہیں گھیر لیا۔ یہ لڑکی بھی آٹو گراف بک لے کر ان کے پاس پہنچی تو کیفی نے اس پر ایک مہمل شعر لکھ دیا اور جب لڑکی نے شعر کی بابت شکایت کی تو انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ پہلے ہم سے آپ نے آٹو گراف کیوں نہیں لیا۔ دونوں ہنس پڑے اور اس ہنسی نے ایک ایسا تصادم پیدا کر دیا' جسے محبت کہتے ہیں اور محبت کے درمیان ایک نہیں کئی اڑچنیں آتی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ لڑکا شیعہ تھا اور لڑکی سنی۔ اس کے علاوہ محض ۴۵ روپے کی نوکری وہ بھی پارٹی کی۔ کب جیل جائے کب باہر آئے کون جانتا ہے۔ آخر کار محبت کی فتح ہوئی اور شوکت کے والد یہ سوچ کر ان کو بمبئی لے آئے کہ زندگی اسے گذارنی ہے۔ گھر والوں کو پتہ بھی نہ چلنے دیا۔ سجاد ظہیر اور رضیہ آپا نے انہیں اپنے گھر بلا لیا اور ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی موجودگی میں ان کا نکاح پڑھوا دیا۔

اسی زمانے میں ان کی نظموں کا مجموعہ ''آخر شب'' طباعت کے مرحلے میں تھا۔ سردار جعفری نے شادی کے تحفے میں ایک کاپی بہت خوبصورت جلد میں بنوا کر شوکت کو دی تھی' اور اندر سردار جعفری نے لکھا تھا: ۵

''موتی کے نام

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبض ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں
اڑنے کھلنے میں ہے نکہت خمِ گیسو میں نہیں
جنت ایک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں

اس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے''

اور دوسرے صفحے پر لکھا تھا:

''ش کے نام

میں تنہا اپنے فن کو آخر شب تک لا چکا ہوں
تم آ جاؤ تو سحر ہو جائے ـــــ'' کیفی

اس طرح ایک وفا شعار بیوی بن کر شوکت خانم کیفی کی زندگی میں آ گئیں۔ شادی کے بعد دونوں اندھیری کمیون کے ایک کمرے میں رہنے لگے۔ کمیون کی دنیا بظاہر شوکت کے لئے بالکل نئی دنیا کا تجربہ تھا۔ وہاں کے لوگ خوش مزاج' روشن خیال' انسان دوست' مظلوم اور استحصال زدہ عوام کے لئے ایک نئی دنیا بسانے کی دھن میں جدوجہد کرتے ہوئے' یہ سرفروش لوگ شوکت کو بڑے پیارے لگے۔ جیسے سب ایک ہی خاندان کے لوگ ہوں۔ جہاں سب ایک دوسرے کو کامریڈ کہہ کر ہی پکارا کرتے تھے۔

شوکت نے یہاں آنے کے بعد کچن کی ذمہ داریاں سنبھال لیں اور کامریڈوں کو اچھا کھانا کھلانے کی کوشش میں حتی الامکان مینو میں تبدیلی کرتی رہتیں۔ انہیں خوش دیکھ کر یہ بہت خوش ہوتیں۔ کیفی شوکت دونوں مل کر پارٹی کا کام کرتے' میٹنگوں میں شامل ہوتے' کبھی سردار' کبھی سجاد ظہیر اور کبھی کیفی تقریر کرتے۔ ان دنوں ان کے بیشتر اوقات مدن پورے کے علاقے میں گذرتا۔ 'مکان' نظم انہوں نے وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ کر کہی تھی۔

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی

ان کے یہاں پہلے بچے کی پیدائش ۱۹۴۹ء میں ہوئی۔ نمونیہ اور غربت نے بچے کی جان لے لی۔ پھر شبانہ اعظمی کی پیدائش بھی دونوں کے لئے ایک آزمائش ثابت ہوئی۔ انہیں کٹھن مرحلوں سے گذرنا پڑا۔ پارٹی والے یہ چاہتے تھے کہ بچہ نہیں ہونا چاہئے لہٰذا اسقاط ضروری ہے' کیونکہ کیفی ان دنوں زیادہ تر انڈر گراؤنڈ رہا کرتے تھے۔ شوکت نے پارٹی کی بات نہیں مانی اور وہ اپنے میکے چلی گئیں۔ جہاں ان کی ماں نے انہیں بہت پیار سے رکھا اور پھر شبانہ وہیں پیدا ہوئی۔

کیفی کی نصف زندگی غربت اور مفلسی میں گذری' انہیں بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا مگر وہ

زندگی کی آزمائشوں سے کبھی بد دل نہیں ہوئے۔ شوکت ایک مضبوط سہارا بن کر ہمیشہ کیفی کو زندگی کے نشیب و فراز سے گذر جانے کا حوصلہ دیتی رہیں۔ زندگی کی چنوتیوں کو دونوں نے مل کر قبول کیا تھا۔ شبانہ اور بابا اعظمی کی خوشگوار زندگی کے لئے کیفی فلموں میں گیت لکھنے لگے اور شوکت اداکاری کی دنیا سے جڑ کر بے حد کامیاب ہوئیں۔ پہلے بچے کی موت سے ہی انہوں نے زندگی کے وہ سبق سیکھے جس کو یاد کر کے آج بھی وہ اپنی ساری خوشیاں بھول جاتے ہیں۔

■

■■ افکار

کیفی کی شخصیت اورفن پر تحریکوں کے ساتھ ساتھ کچھ اہم شخصیتوں کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ ہرانسان کی زندگی پر ان کے ہم عصروں، بزرگوں اور دانشوروں کے اثرات تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ لہٰذا فنکار بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہتا۔ غالب و اقبال ہوں یا دیگر فنکار اپنے عہد کی اہم شخصیتوں سے زندگی کے مختلف دور میں متاثر ہوتا ہے۔ کیفی اعظمی بھی تمام فنکاروں کی طرح اس روایت کی توسیع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی زندگی میں مختلف افراد آئے۔ مختلف نظریۂ حیات سے انہوں نے استفادہ کیا اور مختلف دانشوروں کی قندیلیں ان کے ذہن وشعور کو جلا بخشتی رہی ہیں۔ یہ سلسلہ ان کے عہد طفلی سے شروع ہوتا ہے۔

اولین نقش جو ان کی زندگی پر پڑا جس نے ان کے شعور کو روشنی عطا کی، وہ شخصیت ان کے والد بزرگوار کی تھی۔ بچے کے ذہن پر جو پہلا اور گہرا نقش ابھرتا ہے وہ دیرپا ہوتا ہے۔ بچہ وہیں سے علم وشعور کی پہلی کرن اپنے وجود کے اندر بکھرتا ہوا محسوس کرتا ہے، اور پھر ارتقا کی طرف قدم قدم بڑھتا چلا جاتا ہے۔ گھر کا ماحول اور طور طریقہ اس کی زندگی میں شعوری ولاشعوری طور پر اثر انداز ہوتا ہے، اور بچہ وہیں سے اپنے وجود کی نیو پر پہلی اینٹ رکھ کر اپنی شخصیت کی عمارت تعمیر کرتا ہے۔

کیفی کا گھریلو ماحول شعروشاعری کے اثر میں ڈوبا ہوا تھا۔ ان کی زندگی پر والدین کے بعد جو نقوش مرتسم ہوئے تھے، وہ ان کے بھائیوں اور بہنوں کے تھے۔ تینوں بھائی صاحب بیاض اور صاحب تخلص شاعر تھے۔ بہن کیفی کو میرانیس کے مرثیے سناتیں اور یاد کراتیں۔ ظاہر ہے ایسا ذہن نہ صرف شعری تقاضوں سے آشنا اور بیدار ہوگا بلکہ اس کے اندر شعور کی آگہی اور خود اعتمادی بھی پیدا ہوگی۔ یہی وہ خود اعتمادی اور شعور کی آگہی ہے، جس نے کیفی کو اردو دنیا کا ایک مشہور ومعروف شاعر بنا دیا۔

اس سے قبل کہ ان کے عہد کی عظیم شخصیتوں کا ذکر کیا جائے، کیفی کے پیش رو شعراء وادباء اور چند مذہبی پیشواؤں کے حوالے سے کچھ گفتگو اس لئے بھی ضروری ہے کہ کیفی کی شخصیت اور فن کا مطالعہ آسان ہو جائے اور ان کے شعری رویے کا محاسبہ بھی غیر مانوس نہ رہے۔ یہاں پر اس کی وضاحت بھی

ضروری ہے کہ جن شخصیتوں کے تذکرے اس میں شامل ہیں' ان سے کیفی متاثر بھی ہوئے' اور ان کی تخلیقات پر ان کے اثرات بھی نمایاں ہوئے ہیں۔ مگر ان کی شاعری اور فن پر کسی شاعر یا ادیب کی چھاپ نہیں ہے۔ یہ اپنے لب و لہجے کے منفرد اور انوکھے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کسی کے فن سے مرعوب اور مستعار نہیں ہے۔

کیفی کی نظموں میں مذہبی پیشواؤں کے اخلاق حسنہ' شجاعت' حق پرستی اور حق پسندی کا ذکر بڑے خوبصورت انداز میں ہوا ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ ظالم و مظلوم' قاتل و مقتول' حق و باطل کی لڑائیاں' سیاسی رہبروں نے یا صرف شعراء و ادباء نے ہی نہیں لڑیں' بلکہ ہمارے مذہبی پیشواؤں اور پیغمبروں نے بھی ظلم کے خلاف آوازیں بلند کیں اور جنگیں لڑی ہیں۔ کیفی ایسے آئیڈیل کردار کی تلاش کرنے پر اس لئے بھی مجبور ہوئے کہ انہیں وہ عزم احتجاج مل سکے' جو انسانیت کی کشتی کو پار لگانے کا حوصلہ فراہم کرتا ہے۔ چونکہ ان کا پورا گھرانہ اہل بیت اطہار کے کردار و عمل سے گہری انسیت رکھتا تھا۔ مجالس اہل بیت رسول اللہؐ منعقد ہوا کرتی تھیں۔ اس لئے کیفی کو حضرت امام حسینؓ، حضرت علیؓ اور حضرت زین العابدینؓ ورثے میں ایک آئیڈیل کی حیثیت سے ملے تھے اور انہیں روشن کرداروں سے سبق حاصل کر کے' انہوں نے اپنی زندگی کو ایک ایسا شعور بخشا تھا' جس نے انہیں ظلم کے خلاف احتجاج کرنے' حق گوئی کی طرفداری کرنے اور ظلم و جبر کے چہرے کو بے نقاب کرنے کا ہنر سکھایا اور شاید یہی وجہ ہے کہ میر انیس کے مرثیے کا خاصا اثر ہونے کے بعد بھی قنوطیت یا زندگی سے فرار کا پہلو ان کی شاعری کا حصہ نہ بن سکا' اس سلسلے میں محمد حسن لکھتے ہیں: [۶]

> "مرثیوں کی روایات میں پیدا ہونے والے شاعر نے آنکھوں سے ماتم کے آنسو پوچھے ہیں اور اپنی شاعری کو قنوطیت کے اندھیروں سے محفوظ رکھا ہے اور اندھیروں کو دور کرنے کے لئے تاب ناک تصور تاریخ اپنایا ہے۔ اسی تصور ہی سے اعتماد حاصل کیا ہے۔"

کیفی حضرت امام حسینؓ سے بے حد متاثر تھے۔ امام حسینؓ نے خیر و شر کی جو جنگ لڑی تھی' وہ دنیا کے لئے مشعل راہ ہے۔ انہوں نے اس لڑائی میں اپنی گردن تو دے دی مگر یزید کی خلافت قبول نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عزم اور حوصلے سے متاثر ہو کر انہوں نے امام حسینؓ پر دو نظمیں تخلیق کیں ''حسین کا عزم'' اور ''حسین کی آخری نماز'' چند اشعار ملاحظہ فرمائیں تا کہ کیفی کے افکار کا اندازہ ہو سکے:

جادہ تسلیم پر انسانیت کے نام پر
خونیوں سے بے حیاؤں سے سیاہ کاروں سے جنگ
موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اظہار حق
چھاؤں میں تیغوں کی بے دینوں سے زرداروں سے جنگ

ایک مکمل درس جرأت، حسین ابن علیؓ
کٹ گیا سر بیعت فاسق نہ کی آخر نہ کی

آفریں اے افتخار فاتح بدر و حنین
آفریں صد آفریں اے بیکس و تنہا حسینؓ

حریت کو آج پھر ہے ابن حیدر کی تلاش
وقت کو ہے پھر کروڑوں میں بہتر کی تلاش

حضرت زین العابدینؒ سے متعلق شعر ملاحظہ ہو:

تیغ کو جنبش نہ تھی اور ہل رہی تھی کائنات
تھا زمانہ سے جدا پیکارِ زین العابدینؒ

انہوں نے نوح اور منو مہاراج کو بھی اپنا موضوع بنایا، کیونکہ ایک زمانے میں نیک اور امن پسند لوگوں کی نجات انہیں کے ذریعہ ممکن ہوئی تھی۔ نظم ''انتشار'' کا یہ بند ملاحظہ ہو:

کبھی جمود کبھی صرف انتشار سا ہے
جہاں کو اپنی تباہی کا انتظار سا ہے

منو کی مچھلی نہ کشتیٔ نوح اور یہ فضا
کہ قطرے قطرے میں طوفان بے قرار سا ہے

نہیں کس کو اپنے گریباں کا چاک دکھلاؤں
کہ آج دامن یزداں بھی تار تار سا ہے

حضرت عیسیٰؑ سے متعلق ان کی نظم ''ابن مریم'' کا یہ بند دیکھیں:

تم خدا ہو
خدا کے بیٹے ہو
یا فقط امن کے پیمبر ہو
یا کسی کا حسین تخیل ہو
جو بھی ہو مجھ کو اچھے لگتے ہو
مجھ کو سچے لگتے ہو

کیفی کو ان کے علاوہ جن مذہبی پیشواؤں نے متاثر کیا' ان میں حضرت عمرؓ' حضرت علیؓ' گرونانک' شیوجی' رام' کرشن اور سیتا وغیرہ ہیں۔ ان اہم اور عظیم آئیڈیل کرداروں کی تعلیمات کیفی کے شعور کو جلا بخشتی رہی ہیں۔ اس لئے ان کی رومانی' سماجی' اشتراکی اور احتجاجی شاعری میں اکثر و بیشتر ان کا ذکر ملتا ہے۔ ان مثالی کرداروں کی تعلیمات کی روشنی میں کیفی نے اپنی شاعری کو انسانیت کی بقاء اور اس کے استحصال کے خلاف احتجاج کا ذریعہ بنایا۔ کیفی کی تحریر سے کہیں مذہب بیزاری کا احساس نہیں ہوتا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ عملی زندگی میں مذہب سے دوری اس احساس کو بڑھا دیتا ہے۔

بہر حال کیفی کی شاعری میں جا بجا ایسے الفاظ کثرت سے مل جائیں گے' جو عموماً مذہبی خیالات اور احساسات کے قریب ہوتے ہیں' کچھ ایسے الفاظ بھی مل جائیں گے جو بذات خود ایک تلمیح کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں' کیفی ایسے الفاظ اور تلمیحات کو بڑی خوبی سے استعمال کرتے ہیں اور اپنی نظموں کو ایسے الفاظ کے سہارے ایک نئی جہت دینے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

■■

پیش رو شعراء

پیش رو شعراء و ادباء کے سلسلے میں یہ بات واضح کر دوں کہ ان کے انتخاب میں دور، لب ولہجہ اور موضوع کو ملحوظ رکھتے ہوئے صرف تین شعراء کا ہی انتخاب کیا گیا ہے۔ تاکہ طوالت سے بچتے ہوئے کیفی کی شخصیت اور فن پر ان کے واضح نقوش تلاش کئے جا سکیں۔

میر انیس : ولی اور جوش و اثر تک اردو ادب کے منظر نامے پر کئی اہم شخصیتیں ابھریں اور اردو شعر و ادب نے کتنے ہی تدریجی مراحل طے کئے۔ فکر و فن اور تہذیب و ثقافت کی اس طویل مدت میں جن افراد نے کیفی کی شخصیت پر اپنے افکار کے گہرے نقوش ثبت کئے، ان میں میر انیس کا نام سرفہرست ہے۔ میر انیس نے محاکات اور اپنے طرز اظہار سے خارجی واقعات کی منظر کشی کو جس خوبصورتی سے اپنی شاعری میں برتا ہے، اور کربلا کے واقعے کو اپنا موضوع بنا کر حق و باطل کو اس انداز سے پیش کیا کہ ہر حساس طبیعت اس سانحے پر ابل پڑے گی۔ انیس کے مرثیوں میں منظر نگاری، جذبات وخیالات کی ترجمانی، وجدان یا حیات وممات کی تفصیل، محاکات کی پیش کش، تخیل کی اڑان اور اخلاقی قدریں بدرجہ اتم موجود ہیں، اور یہ تمام باتیں حق و باطل کے درمیان جنگ اور اس سے حاصل پیغام، میر انیس کی شاعری کو اعلیٰ درجے کی شاعری کی سرحد میں داخل کر دیتا ہے۔

شیعہ گھرانوں میں اکثر و بیشتر مرثیوں کی محفلیں سجتی تھیں، اس وقت کیفی کی عمر گیارہ سال کی تھی اور اسی عمر میں کیفی کو میر انیس کے مرثیوں کے سیکڑوں اشعار یاد تھے۔ یہیں سے کیفی کی ذہنی تشکیل شروع ہوتی ہے اور یہیں سے نیکیوں کی تعلیم اور احتجاجی لہجے کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ میر انیس کی شاعری نے نہ صرف کیفی کو بلکہ ایک عہد کو متاثر کیا تھا۔ ان کا انداز بیان اتنا فنکارانہ تھا کہ اس عہد کے دوسرے شعراء ان کی شاعری کے طلسم میں گم ہو گئے تھے۔

الطاف حسین حالی : حالی مصلح قوم بن کر سامنے آئے تھے۔ ان کی آنکھیں عرصۂ دراز سے قوم کی تباہی و بربادی پر اشک بار تھیں۔ جو آگ انہیں جلا رہی تھی اسی آگ میں سرسید کو بھی جلتے دیکھ کر اور بھڑک اٹھی اور قوم کے سامنے ان کی گذشتہ شوکت وعظمت، عزت وشہرت، علم وحکمت اور اعلیٰ

اخلاق و بلند کردار کے نقشے پیش کئے ساتھ ہی ساتھ موجودہ ذلت و رسوائی' جہالت وغربت اور بدحالی کے بھیانک مناظر بھی پیش کرتے رہے۔ حالی کی شاعری اس اعتبار سے ماضی' حال اور مستقبل کی آئینہ دار ہے۔ سرسید کی خواہش پر انہوں نے مدوجزر اسلام (مسدس حالی) لکھا اور مسلمانوں کے احوال و کوائف کے وہ سارے منظر اور پس منظر کو پیش کرنے کی سعی کی' جس سے قوم کی اصلاح ممکن ہو سکے۔

کیفی بھی ماضی کے مضبوط اقدار میں حال کا چہرہ ڈھونڈتے ہیں اور مستقبل کے آئینے میں اسے نکھارنے اور سنوارنے کی سعی کرتے ہیں۔ کیفی بعض جگہوں پر حالی کے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ خصوصاً کیفی کی کامیاب مثنوی ''خانہ جنگی'' میں حالی کے ''شکوہ ہند'' کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

علامہ اقبال : اقبال کی شاعری کا زمانہ بھی ہندوستان کی آزادی سے قبل اور بعد کا زمانہ رہا ہے۔ اقبال کی شاعری میں فطرت کی نیرنگی' حب الوطنی اور آزادی کی تحریک سے زیادہ انسان کی گرتی ہوئی حالت اور اس کی پستی کا ذکر ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری سے دنیا کو ایک پیغام دیا ہے۔ وہ پیغام ہے اخوت اور بھائی چارے کا' وہ پیغام ہے ظلم کے خلاف بغاوت کا' وہ پیغام ہے سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے کا۔ ان کی نظموں نے خود اعتمادی اور خود شناسی کے وہ جوہر دکھائے ہیں یا انسانی عظمت کے گیت اقبال نے جس انداز میں گایا ہے' اس سے فرد کی انفرادیت جلا پاتی ہے۔ انہوں نے حصولِ خودی' عرفان آگہی اور تلاش ذات کے سلسلے میں جو شعری سفر طے کیا ہے' وہ ان کے ذہنی وفنی ارتقاء کی آئینہ دار ہے۔

اقبال کی شاعری سے نہ صرف ان کے عہد کے شعراء متاثر تھے' بلکہ آنے والی نسلیں بھی متاثر ہوتی رہیں گی۔ ظاہر ہے ایسے عہد ساز شاعر سے کیفی کا متاثر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کیفی کی شاعری میں احتجاج' بغاوت' انسانی عظمت' خود اعتمادی اور خود شناسی کے عنصر محض شامل ہی نہیں بلکہ ایک کردار کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اقبال کی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کے موضوع کی توسیع کرتے ہوئے کیفی نے بھی ''ابلیس کی مجلس شوریٰ (دوسرا اجلاس) منعقد کیا۔ ان نظموں کے تجزیاتی مطالعے سے کیفی کے افکار اور ذہنی رویے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اقبال کے بعد جوش نے بھی ایک انقلابی شاعر کی حیثیت سے اپنے عہد کے بے شمار شعراء کو اپنے طرز اظہار سے متاثر کیا تھا' خصوصاً ترقی پسند شعراء کے یہاں اقبال اور جوش کے اثرات نمایاں طور پر محسوس کئے جاسکتے ہیں۔

■■

■■■ تحریکات

کہا جاتا ہے کہ زندگی حادثات کا ایک مجموعہ ہے۔ ان کی نوعتیں مختلف ہوتی ہیں' اور کوئی فرد ان سے اپنے ذہن کو نہیں بچا سکتا۔ ہر شخص خواہ وہ ادیب ہو یا عام آدمی ہو' اپنے زمانے میں ہونے والے واقعات سے اثرات قبول کرتا ہے' اور اپنے عہد کی غیر معمولی شخصیتوں سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ پیدائش سے موت تک یہ سلسلہ کبھی ٹوٹتا ہی نہیں۔ بچے کے ذہن پر ماں باپ کے نقوش گہرے ہوتے ہیں' پھر تربیت گاہوں کی دنیا میں وہ تجربات کی جن منزلوں سے گذرتا ہے' اس کے نقش بھی ثبت ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ کوئی حیرت اور تعجب کی بات نہیں کہ فنکار اپنے عہد کے دانشوروں سے اور واقعات سے قربت کی ایک مدھم آنچ محسوس کرتا ہے۔ عام آدمی اور ایک فنکار میں فرق یہ ہوتا ہے کہ فنکار اپنے شعور اور دانشوری کے طلسم سے ایسے اثرات کو ضائع کر دیتا ہے' جو اس کے نزدیک بے معنی ہوں۔ یا پھر وہ تجزیئے اور استدلال کی روشنی میں ان سے نجات کا نیا راستہ تلاش کرتا ہے۔ بات کچھ بھی ہو حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے' کہ فنکار تخلیقی منزلوں سے گذرتے وقت ان حادثات و واقعات سے غافل نہیں رہ سکتا' جو کبھی اس کی زندگی میں ظہور پذیر ہوئے تھے۔ کئی شخصیتیں اس سفر میں Inspiration کا چشمہ بنتی ہیں' کئی شخصیتوں سے وہ علم و شعور کی آگہی حاصل کرتا ہے' جس سے اس کے وجود کو سہارا ملتا ہے' اور کئی شخصیتیں اس کی انا کی تسکین کا سبب بنتی ہیں' جو کبھی نظریہ سازی کے عمل سے دوچار ہوتی ہیں تو کبھی واضح نصب العین طے کرنے میں مدد کرتی ہیں۔

دنیا کے بڑے آدمیوں کی سوانح حیات پڑھنے سے ہمیں اس صداقت کا علم ہوتا ہے' اور یہ پتہ چلتا ہے کہ کوئی نہ کوئی معشوق اس پردۂ زنگاری میں موجود ہے۔ لہٰذا میں کیفی کے عہد کا جائزہ ان کے عہد کی بڑی تحریکوں' عظیم شخصیتوں اور معاصرین شعراء و ادباء کے حوالے سے پیش کرنے کی سعی کروں گا۔ تاکہ کیفی کے عہد اور حالات' نیز ان کی شخصیت پر دیگر شخصیات کے اثرات کو سمجھا جا سکے۔ کیفی بھی ایک فنکار ہیں' اپنی عمر کے طویل حصے میں انہوں نے بے شک کئی ایسی شخصیتوں سے نیاز حاصل کیا ہوگا' جن کی دانشوری اس عہد پر اپنے واضح نقوش ثبت کر چکی ہوگی۔ کئی تحریکوں سے ان کی قربت رہی ہوگی'

ترتیب

دار و رسن سے پہلے ۷

شخص اور عہد کے عوامل و اثرات

- سوانحی اشارے/احوال ۱۷
- افکار ۲۵
- تحریکات ۳۱
- معاصرین سیاسی و ادبی شخصیات ۴۲

احتساب

- رومانی نظمیں ۵۳
- سیاسی نظمیں ۶۳
- فلمی نغمے ۷۴

ردّونقد ۸۵

محاکمہ

- اردو نظم کی خصوصیات اور کیفی اعظمی ۱۰۵
- اہل نظر اور کیفی اعظمی ۱۲۰

ضمیمہ

- کیفی کی منتخب نظمیں ۱۳۵
- نامے میرے نام ۱۹۷
- تصویریں ۱۹۹

جس نے گردش ایام کے رخ کو موڑا ہوگا۔ لہٰذا ان کے عہد کی تحریکوں اور اہم شخصیتوں کا جائزہ اس لئے بھی ضروری ہو جاتا ہے' کہ کیفی کی شخصیت اور ان کے شعری رویے کو ان کے عہد کے آئینے میں ہی دیکھا جائے' کیونکہ ان کا بچپن غلام ہندوستان کا تھا' جوانی آزادی اور خوشحالی کی جدوجہد میں گزری اور اب جو وقت ان کے پاس رہ گیا ہے' میرے نزدیک وہ نئے خوابوں کے سجانے اور پرانے خوابوں کے ٹوٹنے کا ہے۔ اس لئے سچ پوچھئے تو میرے نزدیک کیفی کا مطالعہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ تقریباً ایک صدی کا مطالعہ ہو جاتا ہے۔

۱۸۵۷ء غدر کے بعد وہی جنگ آزادی کی تحریک ہندوستان کی سب سے بڑی اور اہم تحریک بنی۔ انگریز ہندوستان پر مسلط ہو چکے تھے۔ مغلوں نے اپنی حکومتیں گنوائی تھیں۔ ہر طرف افراتفری' انتشار اور ایک ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ ہندوستان کی اپنی تہذیب زوال پذیر ہو چکی تھی۔ پرانی قدریں مٹ چکی تھیں' ثقافتی سرمائے لٹ چکے تھے۔ ہندوستان کے گلے میں غلامی کا طوق ڈال دیا گیا تھا۔ ہندوستانی تہذیب پر غیر ملکی تہذیب حاوی ہو چکی تھی۔ دھیرے دھیرے ہندوستانی مغربی تہذیب اور فرنگیوں کے عادات و اطوار قبول کر رہے تھے۔ پورے ہندوستان کا اپنا نظام درہم برہم ہو چکا تھا اور ہندوستانیوں کے اندر اپنے وطن میں ہی بے وطنی کا ایک احساس پلنے لگا تھا۔ ہندوستانی عوام ایک محکوم اور مظلوم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ ہر طرح سے انہیں پامال کیا گیا' ہندوستانیوں کا استحصال جہاں تک ممکن ہو سکا فرنگی اس سے باز نہیں آئے۔ ان کے اذہان' ان کی سوچ پر غلامی کی مہر لگا دی گئی تھی۔ اب کوئی آزاد ہندوستان کا خواب نہیں دیکھ سکتا' آنکھوں پر پہرے بٹھا دئے گئے' مگر اسی غلام ہندوستان سے تحریک کی ایک تیز آندھی اٹھی اور پورے ہندوستان پر چھا گئی۔

تحریک آزادی: آزادی کی اس تحریک میں کسی ایک قوم اور ایک نسل نے حصہ نہیں لیا' بلکہ یہاں کے عوام' قوم اور نسل سے اوپر اٹھ کر ایک ہندوستانی قوم کی شکل میں اس جنگ میں شامل ہوئے اور بڑی سے بڑی قربانیاں دیں۔ اپنا گھر بار اور اپنی جانیں قربان کیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس تحریک سے انگریز بے حد خائف ہوئے۔ ہندوستان چھوڑو کا نعرہ یہاں کے گوشے گوشے سے گونج اٹھا۔ یہاں کے ویروں اور جانبازوں نے ڈٹ کر انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ بے شمار ہندوستانی وطن کی خاطر شہید ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ دہلی سے پشاور تک کوئی ایسا درخت نہیں تھا جن پر علماء کی لاش ٹنگی نہ ہو' بائیس لاکھ علماء شہید ہوئے۔ بہر حال ایک وقت ایسا آیا کہ وطن پرستوں نے ہندوستان کے ماتھے سے غلامی کی سیاہی دھو ڈالی' اور انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑا۔

آزادی کی اس تحریک سے وابستہ کئی اہم تحریکیں جنہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ستیہ گرہ یا

عدم تشدد کی تحریک، ریشمی رومال تحریک، تلنگانہ تحریک، ناوابستہ تحریک اور ترقی پسند تحریک کے نام اہم ہیں۔ مذکورہ تحریکات کی منزل ایک تھی راستے الگ الگ تھے۔ میں نہایت اختصار کے ساتھ ان تحریکات سے متعلق چند باتیں عرض کرنا چاہوں گا، تاکہ ان کے اغراض ومقاصد اور حالات کے پیش نظر کیفی کے حالات اور اس کے سیاسی وسماجی پس منظر کے ساتھ اس پورے عہد کے مزاج کا پتہ لگایا جا سکے۔

کیفی کی شخصیت اور فن پر آزادی کی تحریک کے گہرے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ کیفی نے انگریزوں کے ظلم وستم اور بربریت کو بہت قریب سے دیکھا تھا، اور ہندوستانی عوام کی محکومیت اور مظلومیت کو شاید اس سے بھی زیادہ قریب سے محسوس کیا تھا۔ کیفی بائیں بازو کی تحریک سے نظریاتی طور پر وابستہ تھے۔ (باضابطہ وابستگی آزادی کے بعد ہوئی)۔ کیفی جنگ آزادی میں ایک طرف قلم سے جنگ لڑ رہے تھے، تو دوسری طرف میدان عمل میں مجاہدے بھی کر رہے تھے۔ ان کی بیشتر نظموں کا موضوع بالواسطہ یا بلاواسطہ آزادی سے متعلق ہے۔ ہندوستان کی آزادی کا جو تصور ان کے ذہن میں تھا، آزادی کے بعد انہیں مایوسی ہوئی۔ جس کا خوبصورت اظہار نظم ''چراغاں'' میں ہوا ہے۔ شروع میں بائیں محاذ سے وابستہ لوگوں نے اس آزادی کو قبول نہیں کیا اور فیض کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

'یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر'

اور سردار نے کہا:

کون آزاد ہوا؟ کس کے ماتھے سے غلامی کی سیاہی چھوٹی

ستیا گرہ تحریک : ظالم اور مظلوم کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے، جتنی کہ انسانی تاریخ۔ ظلم وستم کی اس طویل تاریخ کے ساتھ ہی سچائی، انصاف اور اہنسا کی داستان بھی زمانہ قدیم سے موجود ہے۔ ہماری تاریخ کا ایک بڑا حصہ اگر ظلم وستم، اقتدار واستحصال کا احاطہ کئے ہوئے ہے، تو صبر وتحمل، شرافت اور ظلم کو برداشت کرنا بھی انسانی مقدر تصور کیا جاتا رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں اس کی نوعیت ضرور بدل گئی ہے۔ موجودہ عہد میں ظالم یا طاقتور کے خلاف احتجاج بلند کرنے کا اصول مرتب ہو چکا ہے، یا یوں کہیں کہ ایک سلیقہ وجود میں آچکا ہے۔ ہم اس سلیقے کو 'ستیا گرہ' کا نام دے سکتے ہیں۔ ستیا گرہ کے اصول کو گاندھی جی نے تشکیل دیا تھا۔ ان کے نزدیک یہ اہنسا اور سچائی کے عرفان کا عمل ہے اور یہ عمل کیفی کی پوری شاعری میں موجود ہے۔ ان کا احتجاجی لب ولہجہ بھی ستیا گرہ کے فلسفے کی وضاحت ہے۔

گاندھی جی نے اہنسا اور سچائی کے امتزاج سے احتجاج کے جس سلیقے کو ستیا گرہ کا نام دیا۔ اگر اس کے تاریخی تناظر پر غور کیا جائے تو شروع سے لے کر اب تک کئی ایسے واقعات سامنے آتے ہیں۔ سقراط کا زہر پی لینا، حضرت عیسیٰؑ کا مصلوب ہو جانا، سچائی کی فتح یابی کے لئے حضرت امام حسینؓ کا عدم تشدد کا

رویہ اختیار کرنا' پھر احتجاج کی روش اپنانا' یہ تمام واقعات تھوڑے فرق کے ساتھ ایک طرح سے ستیا گرہ کے عمل ہی تو ہیں۔

کیفی اعظمی کی شاعری کو اگر اسی تناظر میں دیکھیں تو معلوم ہوگا' کہ ان کی شاعری میں احتجاج' سچائی کے حصول کا ایک موثر وسیلہ ہے۔ جسے گاندھی جی نے اپنی زندگی میں برتا بھی اور آنے والی نسلوں کو ستیا گرہ کا ایک عظیم ورثہ بھی عطا کیا۔ کیفی کی شخصیت اور فن پر اس عمل کے گہرے نقوش شامل ہیں۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ اسی احتجاج سے پر ہے' جو انہیں انہسا اور سچائی سے قریب کر دیتی ہے۔

ناوابستہ تحریک: ۱۹۳۹ء میں انگریزوں کی جنگی کوششوں میں انڈین نیشنل کانگریس نے ہاتھ بٹانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کی طرف سے جنگ یا امن کے اعلان کرنے کا حق' وہ کسی دوسرے یا سامراجی حکمرانوں کے حوالے کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ہندوستانی قوم کے آزادانہ کردار کے بارے میں ۱۹۴۷ء میں ایشین ریلیشنز کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا تھا:

> "ہم عرصہ دراز سے مغربی درباروں اور چانسلروں میں داد خواہ رہے ہیں۔ اب یہ کہانی ماضی کی داستان بن جانی چاہئے۔ ہم پیروں پر کھڑے ہونا اور ان تمام لوگوں کے ساتھ تعاون کرنا چاہتے ہیں جو ہم سے تعاون کرنے کو تیار ہیں۔ ہم دوسروں کے ہاتھوں کا کھلونا بننا نہیں چاہتے۔"

نہرو نے شدت سے یہ محسوس کیا تھا کہ انسان یا انسانی اقدار سے' بین الاقوامی رشتوں کے لئے ہمارا یہ پرانا نظریہ سود مند یا کافی نہیں ہے۔ ناوابستہ تحریک کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی' کہ شدید مخالفت اور انتشار کے باوجود ہمیں ان چنوتیوں سے یا چیلنجز سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ بخشا جو درپیش تھے۔

کیفی ذہنی طور پر ناوابستہ تحریک سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنا فیصلہ خود کرنے کی حمایت میں شروع سے رہے ہیں۔ وہ کسی بھی حال میں سامراجی حکمرانوں کو یہ حق دینا نہیں چاہتے' ان کی پوری لڑائی اور احتجاج' انہیں سامراجی قوتوں اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف تھا۔ جس کی بھرپور عکاسی ان کی شاعری میں ہوئی ہے۔

قومی تحریک: یہ تحریک بھی انڈین نیشنل کانگریس کی ہی تحریک تھی۔ اس تحریک کے

ذریعے جو جنگ لڑی جارہی تھی' وہ ایشیا اور افریقہ کی مجبور قوموں کی آزادی کی لڑائی تھی' یہ تحریک غلامی اور اس کی آزادی کی جدوجہد کا ایک لازمی حصہ تھی جو متعدد پلیٹ فارم اور تنظیم کے ذریعے دانشوروں' مزدوروں اور کسانوں کے درمیان ایک زبردست انقلابی تصور لے کر ابھری تھی۔ ۱۹۲۹ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس میں نہرو نے ملک کی صورت حال کے بارے میں کہا تھا۔ ۸

"ھندوستان کا مطلب کسان اور مزدور ھے۔ اپنے کاموں میں ھم اسی حد تک کامیاب ھوں گے' جس حد تک ھم کسان اور مزدوروں کی ضرورتیں پوری کریں گے اور اس کے معیار زندگی کو اونچا کریں گے۔ ھماری قومی تحریک کی مضبوطی کا پیمانہ یھی ھے کہ ھم اس مقصد پر کتنا قائم رھتے ھیں۔ کھا جاتا ھے کہ کانگریس کے لئے ضروری ھے کہ وہ سرمایہ دار اور مزدور نیز زمیندار اور کسان کے درمیان مناسب توازن قائم رکھے۔ لیکن یہ توازن ابھی تک ایک جانب جھکا ھوا ھے اور اب بھی ایسا ھی ھے کہ آج کی حالت کو جوں کا توں بنائے رکھنا ناانصافی اور استحصال کو قائم رکھنا ھے۔ صورتحال کو درست کرنے کا واحد طریقہ یھی ھے کہ کسی ایک طبقہ پر کسی دوسرے طبقہ کا غلبہ نہ رھنے دیا جائے۔"

مذکورہ تحریک یا اقتباس کے تناظر میں' کیفی کی شاعری کا جائزہ لیں تو یہ بات کھل کر سامنے آئے گی' کہ کیفی کے یہاں قوم کا تصور صرف ہندوستانی قوم نہیں' بلکہ پوری انسانی قوم کا تصور غالب ہے۔ ان کی پوری شاعری میں کسان اور استحصال زدہ مزدوروں کے دکھ نمایاں ہیں۔ وہ ہمیشہ ایک غیر طبقاتی سماج اور اشتراکی نظام کا خواب دیکھتے رہے اور اپنی پوری زندگی اسی جدوجہد میں لگا دی۔ وہ استحصال کے خلاف سامراجی طاقتوں سے لڑتے رہے' تاکہ مزدوروں اور کسانوں کی زندگی میں ایک توازن قائم ہو سکے۔ اس طرح احتجاج اور ان سے متعلق تمام چنوتیاں' آپ کیفی کی شاعری میں محسوس کر سکتے ہیں۔ جن پر وقت کی گرد ابھی جمی نہیں ہے۔ جس سوشلسٹ ہندوستان کا خواب نہرو نے دیکھا تھا' کیفی کی پوری شاعری اس خواب کی تعبیر معلوم ہوتی ہے۔ کیفی کی شاعری میں جو احتجاج ہے وہ سامراجیت اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہی تو ہے' یا یوں کہیں کہ ان تمام تحریکات کے اغراض و مقاصد کیفی کے شعری مزاج اور ان کے رویے میں شامل ہو گئے ہیں تو غلط نہ ہوگا' کیونکہ کسان' مزدور' اور استحصال زدہ

عوام ہی کیفی کی شاعری کے محبوب اور زندہ کردار ہیں' شاید اسی لئے ان کی شاعری نوید فتح اور قلب عوام کی دھڑکن بن کر عظمت حاصل کر لیتی ہے۔

تلنگانہ تحریک :تلنگانہ تحریک آزاد ہندوستان کی تاریخ میں ایک غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔اس تحریک کی ابتداء آزادی سے پہلے ہوئی تھی۔مگر پولس ایکشن کے بعد ہی اس کا عروج سامنے آتا ہے۔ یہ کسانوں کی ایک ایسی باغیانہ تحریک تھی' جو آندھرا پردیش کے علاقے سے اٹھی تھی۔ہمیں اس کے عروج کا پتہ یا اس کی بہترین مثال نکسل باڑی بنگال تحریک سے ملتی ہے۔اس تحریک اور بغاوت کے دوران سیکڑوں گاؤں کمیونسٹ پارٹی کے اثر سے کسانوں کے قبضے میں آ گئے تھے' اور وہاں ان کی اپنی ایک الگ حکومت قائم بھی ہوگئی تھی اور کسانوں نے اپنے مزاج کے اعتبار سے اپنی اپنی عدالتیں قائم کرلی تھیں۔انقلاب کی چنگاریوں کو ہوا دینے میں اس تحریک نے ایک نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ خصوصاً اس کے اثرات اردو کے ادیب وشاعر پر پڑے اور ایک اچھا خاصا ادب وجود میں آیا۔ڈھیر ساری تخلیقات اس تحریک کے زیر اثر تخلیق کی گئیں۔یہ تحریک کیفی کے دور شباب میں پروان چڑھی تھی۔ مخدوم اس تحریک کے ہیرو تھے۔کیفی بھی دوسرے شعراء کی طرح اس تحریک سے منسلک رہے اور انہوں نے اس تحریک کو اپنی زندگی اور شاعری کے لئے ایک عظیم محرک تصور کیا۔وہ اس تحریک سے کس حد تک متاثر تھے۔ان کی نظم 'تلنگانہ' کے کچھ بند سے ہی اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

صغیف مائیں' جوان بہنیں' جھکے ہوئے سر اٹھا رہی ہیں
سلگتی نظروں کی آنچ' بھیگی بھیگی پلکیں سکھا رہی ہیں
لہو بھری چولیوں' پھٹے آنچلوں سے پرچم بنا رہی ہیں
ترانۂ جنگ گا رہی ہیں
ذرا پکار دو بے چین نوجوانوں کو
ذرا جھنجھوڑ دو کچلے ہوئے کسانوں کو
ادھر سے قافلۂ انقلاب گزرے گا
بچھا دو سینۂ گیتی پہ آسمانوں کو
سفید پلکوں' کھینچی ہوئی جھریوں میں شعلے مچل پڑے ہیں
جواں نگاہوں' جواں دلوں سے' ہزار طوفاں ابل پڑے ہیں
بھرے ہوئے دامنوں میں پتھر' گھروں سے بچے نکل پڑے ہیں
سب ایک ہی سمت چل پڑے ہیں

لہو سے سینۂ گیتی کے داغ دھوئے ہیں
جگا کے خاک کی قسمت شہید سوئے ہیں
کہیں کی فوج سہی، اس طرف کا رخ نہ کریں
یہاں زمین میں بم من چلوں نے بوئے ہیں

علی گڑھ تحریک: آزادی کے بعد ہندوستانی عوام خصوصاً مسلمانوں کے اندر جو تعلیمی اور تہذیبی پسماندگی آئی تھی۔ اسے سرسید احمد خاں نے بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ آزادی کے بعد، تقسیم کے سانحے سے مسلمان خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگے ہیں۔ ان کے تاریخی اور ثقافتی سرمائے تو پہلے ہی لٹ چکے تھے اور مسلمانوں کی وہ تمام اعلیٰ قدریں پامال ہو رہی تھیں، جن پر انہیں ناز تھا۔ اس پامالی کی ایک وجہ ان کی ناخواندگی تھی۔ تعلیمی نظام بھی ان کے یہاں درہم برہم ہو چکا تھا اور جو کچھ بچا تھا، اس کا تعلق بھی مذہب اور دینیات تک ہی محدود ہو کر رہ گیا تھا، اور وہ ارتقا کی راہ سے کٹ کر بالکل سمٹ چکے تھے۔ جدید علوم وفنون، سائنس اور جدید ٹکنالوجی مسلمانوں کے لئے خواب بن گئے تھے۔ وہ تعلیم کے اس دھارے کا رخ نئی دنیاؤں کی تلاش سے جوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے دل و دماغ میں ایک فرسودہ خیال گھر کر گیا تھا کہ اس جانب رخ کرنا ہی اپنی تباہی کو دعوت دینا ہے۔ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی یا بٹھا دی گئی تھی، کہ جدید علوم سے رشتہ جوڑنے کے لئے انہیں اپنی تہذیب اور تمدن سے اپنا رشتہ منقطع کرنا ہوگا۔ شاید اس لئے وہ مغربی تعلیم کو کفر سمجھنے لگے تھے۔

سرسید کی دور اندیش آنکھیں نہ صرف مسلمانوں کی موجودہ حالت دیکھ رہی تھیں، بلکہ وہ مسلمانوں کے آنے والے کل کو بھی دیکھ رہی تھیں کہ اگر مسلمان جدید تعلیم کے دھارے سے کٹ گئے، تو ان کا مستقبل کتنا تاریک اور پرخطر ہو جائے گا۔ پھر انہوں نے یہ عہد کر لیا کہ انہیں مسلمانوں کو ہر حال میں جدید علوم سے جوڑنے کی سعی کرنی ہے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے ذہن میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا ایک عملی خاکہ تیار کیا اور سوچا کہ اس یونی ورسٹی کے ذریعہ ہی مسلمانوں کو اسلامی تہذیب اور اپنی شناخت کے ساتھ مغربی تعلیم کے دھارے سے جوڑنا ممکن ہو سکے گا۔

لہٰذا سرسید احمد خاں نے ایک تحریک علی گڑھ کے نام سے شروع کی اور مسلمانوں کو اپنا منشاء بتایا کہ جدید یا مغربی تعلیم سے جڑنا غلط نہیں ہے۔ غلط ہے اپنی شناخت اور تہذیب کو ترک کر دینا۔ علی گڑھ تحریک کے ذریعے سرسید مسلمانوں کو ایک آئیڈیل اور نمونے کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے، کہ فلسفہ مسلمانوں کے دائیں ہاتھ میں ہو، بائیں ہاتھ میں نیچرل سائنس اور سر پر لا الہ الا اللہ کا تاج ہو۔ اول تو ان کی بڑی مخالفت ہوئی، مگر بعد میں مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اس بات سے متفق ہو کر

علی گڑھ تحریک میں شامل ہوا۔

سرسید کی اس اصلاحی تحریک سے اردو شعر و ادب نے بھی بدلتی ہوئی روش اور زندگی کی چنوتیوں کو قبول کرتے ہوئے' ایک نئے سفر کا آغاز کیا۔ سرسید کی یہ تحریک خالص مقصدی تھی۔ لہٰذا اس کا خاصا اثر اردو ادب پر پڑا اور وہاں بھی روایت کے بہت سے فرسودہ خیالات سے روگردانی کا ایک عمل سامنے آیا۔ اس تحریک نے بہت قلیل مدت میں انسانی زندگی اور شعر و ادب دونوں کو یکساں طور پر متاثر کیا۔ لہٰذا اسی تحریک سے ترقی پسند تحریک کی راہ ہموار ہوتی چلی گئی' کیونکہ زندگی کی مقصدیت یا افادی پہلو پر دونوں کی نظریں جمی ہوئی تھیں۔ واضح ہو کہ علی گڑھ تحریک کا دائرۂ کار ہندوستان اور مسلمان تھا' مگر ترقی پسند تحریک کا حلقہ اثر لامحدود رہا ہے' اس اعتبار سے دیکھا جائے تو کیفی بھی تھوڑے فرق کے ساتھ سرسید کے ہمنوا معلوم ہوتے ہیں' کیونکہ وہ جس نظریہ سے تعلق رکھتے ہیں اس کا تعلق بھی ایک دوسری نوعیت کے ساتھ انسانی افادیت اور ترقی پسندی کی ہی بات کرتا ہے۔

ترقی پسند تحریک : ترقی پسند تحریک کے بنیادی مقاصد میں یہ باتیں بڑی وضاحت سے کہی گئی تھیں کہ 'ہندوستان کروٹیں بدل رہا ہے اور ایک نیا سماج جنم لے رہا ہے۔ پرانی قدریں مٹ رہی ہیں' لہٰذا ادیبوں پر یہ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں کہ وہ اپنے ادب میں بدلتی ہوئی قدروں کو پیش کریں اور ملک و قوم کی تعمیر و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔' روایت اور موجودہ ادب سے انحراف کرتے ہوئے ترقی پسندوں نے اس ذمہ داری کو قبول کیا اور ادب کو زندگی کے حوالے سے برتنے کی سعی کی اور اپنے منشور میں یہ بات کہی گئی کہ ''موجودہ ادب جو کہ انحطاط پذیر ہے وہ بھگتی اور ترک دنیا کی تعلیم دیتا ہے اور دنیا سے فرار کے جذبے ابھار کر گوشہ نشینی یا ذات کے خول میں بند ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ لہٰذا ایسے ادب میں عقل و فکر کی کہیں گنجائش نہیں ملتی۔'' انجمن ترقی پسند مصنفین کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ ادب کو پنڈتوں اور مولویوں کی قدامت پرستی اور اندھی تقلید سے نکال کر عوام سے قریب کرے اور ادب کو ادب برائے زندگی کا آئینہ دار بنائے۔ جس سے ہمارا مستقبل اور امکانات روشن ہو سکیں۔ لہٰذا ان کے نزدیک ادب کو ہر حال میں زندگی کے روزمرہ مسائل سے سروکار رکھنا چاہئے جس میں سماجی پستی اور سیاسی غلامی کے موضوعات شامل ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے ذریعے اس بات کی وضاحت کی گئی تھی کہ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کو انفرادیت یا داخلیت سے نکل کر انسانوں کے اجتماعی مفادات اور تہذیب و ثقافت کی اعلیٰ اقدار کے تحفظ کے لئے آگے آنا چاہئے۔ رجعت پسند ادب اور رجعت پسند قوتوں کے خلاف آواز بلند کرنی چاہئے۔

۱۵ اپریل' ۱۹۳۶ء کو ترقی پسند تحریک کی کل ہند کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی' جس کی صدارت منشی

پریم چند نے کی اور صدارتی خطبے کے بعد ایک واضح منشور سامنے لایا گیا۔ جسے سب نے منظور کیا۔ منشور ملاحظہ ہو: ۹

"ایک منصوبے کے تحت جلسے منعقد کرنا' بامقصد لٹریچر شائع کرنا' ترقی پسند مصنفین کی مدد کرنا اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف آواز بلند کرنا شامل تھا۔ رجعت پسند رجحانات کے زمرے میں وہ سارے معاشی اور معاشرتی و ظائف شامل تھے' جو ایک روایت کے طورپر ہزاروں برس سے بغیر کسی تبدیلی کے چلے آرہے تھے۔ لیکن جو ترقی پسند نقطہء نظر کے مطابق ترقی کے رستے میں ایک بڑی رکاوٹ تھے۔"

پریم چند نے اپنا خطبہ ختم کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ: ۱۰

"ہماری کسوٹی پر ادب کھرا اترے گا' جس میں تفکر ہو' آزادی کا جذبہ ہو' حسن کا جوہر ہو' تعمیر کی روح ہو' زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت' ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے' سلائے نہیں کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔"

مذکورہ اقتباس کی روشنی میں ترقی پسند تحریک کے موقف کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ ادب ترقی کی راہ میں ذہنی فضا ہموار کرنے اور فکری سرگرمیوں کو اجاگر کرنے میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

ترقی پسند ادب کو سرمایہ دارانہ نظام اور فاشزم سے بغاوت کا ادب' ظلم و استحصال کے خلاف احتجاج بلند کرنے کا ادب' اور فرسودہ روایت سے انحراف کا ادب بنا کر پیش کیا گیا' جو سماجی ترقی کے عکاس ہونے کا دعویدار بھی ہے اور عمل دار بھی۔

ہندوستان کی تمام تحریکیں خواہ' وہ ستیہ گرہ تحریک ہو' یا ناوابستہ تحریک' قومی تحریک ہو' یا تلنگانہ تحریک یہ تمام تحریکیں اپنے موقف کی تکمیل یا حصول کے بعد دم توڑ دیں۔ مگر ان تمام تحریکوں نے انسانی زندگی کو ترقی اور افکار کے بے شمار نئے زاویئے عطا کئے۔ جو ہماری زندگی میں تحرک پیدا کرتی رہی ہیں۔ یہ تحریکیں سماجی کم سیاسی زیادہ رہیں' مگر ترقی پسند تحریک ایک ایسی تحریک ہے' جو اپنے موقف کے اعتبار سے صدیوں زندہ رہ سکتی ہے۔ کیونکہ یہ تحریک سماجی اور معاشرتی زیادہ رہی' مگر اس کا ادب سماجی اور

معاشرتی کم ادبی زیادہ رہا۔ ممکن ہے اس بات سے کسی کو اختلاف ہو، مگر اس بات سے انکار کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی ہے کہ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو ایک بیش بہا سرمائے سے مالا مال کر دیا ہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ اس کی پشت پناہی کرنے والے لوگ سیاست سے جڑے رہے اور سیاست کے تال میل سے اس انجمن کے چراغ کو روشن رکھنے کی کوششیں بھی ہوئیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند ادب پر کچھ سیاست کا رنگ بھی حاوی نظر آتا ہے۔ اس طرح کے اعتراضات کے جواب میں علی سردار جعفری کا کہنا ہے کہ: [11]

"سیاست ہر جگہ ہے، ہر طرف ہے، فن اور ادب کی ہر تخلیق میں ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ کہیں سیاست ترقی پسند ہے اور کہیں رجعت پرست۔ جب فن پارے میں ترقی پسند سیاست ہوتی ہے تو فوراً انگلیاں اٹھتی ہیں۔ یہ فن نہیں سیاست ہے اور اگر سیاست رجعت پرست ہے تو وہ اعلیٰ درجے کا فن ہے تفریح ہے۔"

سردار جعفری دوسری جگہ سیاست کے سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں: [12]

"دراصل سیاست سے آلودہ ہو کر آرٹ خراب نہیں ہوتا۔ وہ خراب ہوتا ہے آرٹسٹ کی ذہنی اور جذباتی کمزوریوں سے۔"

پریم چند کے خطبہ صدارت کے حوالے سے سردار جعفری نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا:

"ادب سیاست کے پیچھے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ وہ مشعل ہے جو سیاست کو راہ دکھاتی ہے۔ تو وہ ادیب کی انفرادیت اور معاشرے کی اجتماعیت کے رشتے کو ظاہر کر رہے تھے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سیاست بھی ایک تحریک ہے جو براہ راست عوام سے تعلق رکھتی ہے اور طاقت حاصل کرتی ہے اور سماج کو بناتی اور بگاڑتی ہے۔"

محولہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ادب سیاست کے پیچھے نہیں چلتا، اسے

راہ دکھاتا ہے۔ چونکہ ادب اور سیاست دونوں کا ایک مضبوط رشتہ عوام سے ہے' لہٰذا دونوں اگر ساتھ ہوں' تو ادب خراب نہیں ہوتا بلکہ فنکار کی ذہنی اور جذباتی کمزوریوں سے وہ خراب ہو جاتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی تمام تحریکات کے مقاصد کو اپنی تحریک کے لئے بہت اہم تصور کیا اور اپنے دامن فکر کو اتنا کشادہ کیا کہ وہ تمام تحریکات دم توڑ کر بھی ترقی پسند ادب میں اپنی نوعتیں بدل کر کسی نہ کسی طور پر زندہ رہیں' اور کسی نہ کسی صورت میں ترقی پسند شعراء و ادباء کے یہاں اپنی روحانیت بھی اجاگر کرتی رہیں۔

ترقی پسند ادب نے بے شمار تخلیق کار اور نقاد پیدا کئے' جس کی فہرست سازی مقصد نہیں۔ بات چونکہ کیفی کے حوالے سے ہو رہی ہے تو کیفی کی پوری شاعری' کیفی کی پوری زندگی' ترقی پسند ادب کی ترجمان ہے۔ وہ ترقی پسند ادب کے اس قدر قائل ہیں کہ اپنی پوری زندگی اس نظریئے کی ترویج و اشاعت میں لگادی اور آج ان کی پہچان ایک معتبر ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے مسلم ہے۔ ان کی شخصیت اور فن پر ترقی پسند رجحانات کے بہت گہرے نقوش نمایاں ہیں۔ انہوں نے ترقی پسندیت کو نہ صرف خونِ جگر سے سینچا ہے بلکہ اپنی شاعری کے ذریعے اسے جو قوت گویائی عطا کی ہے' اس سے انکار کرنا کیفی کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی۔

■■■

اعلانِ حق میں خطرۂ دار و رسن تو ہے
لیکن سوال یہ ہے کہ دار و رسن کے بعد؟
کیفی

■■■■ معاصرین سیاسی و ادبی شخصیات

یہاں بھی کیفی کے عہد کی تین عظیم سیاسی شخصیتوں کے ذکر کا مقصد ان کے ذہنی رویے اور فن پر غالب رجحان کا پتہ لگانا ہے۔ کیفی کی شخصیت اور فن پر تحریک اور اس سے وابستہ دانشوروں اور مفکر رہنماؤں کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ فی الوقت میں تین اہم سیاسی شخصیتوں کا ذکر اس لئے بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کا تعلق ہندوستان اور ہندوستان کے مسائل سے بہت مربوط تھا اور ان کا شمار تحریک آزادی کے بانیوں میں ہوتا ہے۔

مہاتما گاندھی: گاندھی جی ایک بے خوف رہنما تھے اور درویشانہ صفت کے مالک تھے۔ ان کی سادگی ایک مثال تھی' انہوں نے برطانوی سامراج کی غلامی سے ہندوستان کو نجات دلایا۔ گاندھی جی نے اپنی پوری زندگی ظلم کے خلاف احتجاج کرنے اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف جدوجہد کرنے میں لگا دی۔ ہندوستانیوں پر ہونے والے مظالم کو انہوں نے بہت قریب سے دیکھا تھا' اور ان کے دکھ درد کو محسوس کیا تھا۔ وہ ہمیشہ اخلاقی اقدار کے پاسدار رہے اور اپنے رہنما اصولوں پر ثابت قدم رہتے ہوئے اہنسا کے پجاری بنے رہے۔ انہوں نے حب الوطنی' عدم تشدد اور اپنی قربانیوں کی عملی مثالیں پیش کیں۔ گاندھی جی کا دل صرف اپنے ملک اور اپنے ملک کے باشندوں کے لئے کشادہ نہیں تھا' بلکہ پوری انسانیت کی محبت ان کے دل میں سمائی ہوئی تھی۔ گاندھی جی کے اصول اور آدرش آج دنیا کے لئے مشعل راہ ہیں۔ ان کی سادگی' ان کی نیک نیتی اور ان کی قربانیوں نے انہیں دنیا کی عظیم ہستیوں کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا۔ تحریک آزادی سے متعلق ہندوستانی عوام کے اندر جو بیداری آئی تھی' اس جدوجہد میں گاندھی جی بہت آگے نکل جاتے ہیں وہ گھوم گھوم کر لوگوں کے جذبے ابھارتے رہے اور آزادی کے خواب بھی آنکھوں میں سجاتے رہے۔ انہوں نے پورے ہندوستان میں بسنے والے مختلف اقوام کو ایک ہندوستانی قوم میں تبدیل کر دیا' اور پھر یہ قوم ایک آواز ہو کر ''ہندوستان چھوڑو'' کا نعرہ بلند کرنے لگی' یہ آواز اتنی گھن گرج کے ساتھ سامنے آئی کہ فرنگیوں کی مضبوط بنیادیں ہلنے لگیں اور ایک وقت ایسا آیا کہ رسوا ہو کر فرنگیوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑا۔ ہر چند کہ خواب کی تعبیر بڑی جدوجہد اور

قربانیوں کے بعد سامنے آئی تھی۔ ہندوستان کو آزادی تو ملی مگر وہ آزادی نہیں ملی' جس کا سپنا گاندھی جی نے دیکھا تھا۔ ملک کی آزادی کے فوراً بعد ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ متحدہ ہندوستان کا جو تصور اور خاکہ گاندھی جی کے ذہن میں تھا وہ سب کرچیاں بن کر ان کے سامنے آ گئیں۔

گاندھی جی کی تحریک' جدوجہد' قربانیاں اور ان کے افکار کا آپ جائزہ لیں گے تو اندازہ ہوگا کہ وہ انسانی عظمت کے قائل تھے' اور انسان کی بالادستی کے طرفدار رہے۔ وہ دنیا سے ظلم و ستم' استحصال واستبداد کی کہانی ختم کر دینا چاہتے تھے۔ کیفی اعظمی اپنی زندگی کا آغاز بھی کچھ اسی ڈھنگ سے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں' انہوں نے بھی سرمایہ دارانہ نظام کی بہیمیت اور بربریت کو بہت قریب سے دیکھا تھا' مزدور' کسان اور استحصال زدہ عوام کے لئے وہ انصاف چاہتے تھے اور اس انصاف کے حصول کے لئے انہوں نے زبردست احتجاج کیا' مگر ان کا احتجاج بھی انہا کے اصول کا پابند رہا وہ اسی ضابطے کے تحت آواز بلند کرتے رہے۔ ان کا احتجاج' ان کی چیخ اور جدوجہد انسانی ہمدردی کے لئے ہی تھی۔ کیفی بھی گاندھی جی کی طرح ظلم اور عوامی استحصال کو ختم کرنا چاہتے تھے' جسے سرمایہ داروں اور ظالموں نے شروع کیا تھا۔ وہ گاندھی جی سے متاثر نظر آتے ہیں' انہوں نے اپنی نظم میں گاندھی جناح ملاقات کو بڑی خوبصورتی سے نظم بھی کیا ہے۔

مولانا آزاد : مولانا آزاد ایک عظیم مفکر اور قوم پرست رہنما بن کر ہندوستان کے سیاسی و مذہبی افق پر طلوع ہوئے۔ آزاد نے اپنے معاشی' سماجی اور سیاسی نظریات سے عوام الناس کو ہی نہیں' بلکہ سیاسی رہنماؤں اور مفکروں کو بھی یکساں طور پر متاثر کیا۔ مولانا آزاد نے اپنی پوری زندگی ملک کی خدمت میں لگا دی' ان کا مقصد ملک کو سیاسی نقطۂ نظر سے مستحکم' سماجی نقطۂ نظر سے ترقی یافتہ اور اقتصادی نقطۂ نظر سے خوشحال بنانا تھا۔ وہ بڑے خلوص کے ساتھ ہندوستانی قوم کی خدمت کرتے رہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ کسی ایک پارٹی' ایک قوم یا صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر کے لئے قابل احترام ہیں۔ سیاسی اور سماجی شعور کے ساتھ ساتھ مولانا آزاد کے ادبی شعور اور مذہبی افکار کافی بلند تھے۔ وہ بے پناہ تنظیمی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ دنیا میں یقیناً کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جنہیں تاریخ بنا دیتی ہے' اور کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو خود تاریخ بناتے ہیں۔ مولانا آزاد ایسے ہی عہد ساز اور تاریخ ساز شخصیت کے مالک تھے۔ قدرت نے انہیں بے پناہ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا تھا جن کی دنیا منتظر تھی۔ ایسی شخصیتیں صدیوں میں جنم لیتی ہیں اور پوری دنیا کو متاثر کرتی ہیں۔

کیفی اعظمی بھی ان کی شخصیت اور علمیت سے متاثر ہوئے' نیز ان کی شخصیت اور علم و آگہی سے استفادہ بھی کیا۔ ان کی تقریروں اور تحریروں سے کیفی مانوس ہیں۔ ان کی سوچ اور فکر سے ایک طرح کی

گہری انسیت بھی رکھتے ہیں کیونکہ دونوں کے خواب مشترک تھے۔

پنڈت نہرو: ہندوستان کی جنگ آزادی میں بیک وقت کئی رجحانات کام کر رہے تھے۔ ایک کی قیادت گاندھی جی کر رہے تھے' تو دوسرا نمایاں رجحان بائیں بازو کے افراد کے ذریعے پرورش پا رہا تھا' اور ان دونوں کی درمیانی کڑی جواہر لال نہرو تھے۔ جو بنیادی طور پر ایک دانشور اور مفکر تھے' اور حساس ماڈرن ذہن کے مالک بھی' جو ہندوستان کو ہر حال میں ایک ترقی یافتہ صنعتی ملک کی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ مشترکہ تہذیب کے نقیب بھی تھے' ان کا ذہن بنیادی طور پر ایک آرٹسٹ کا تھا اس لئے بھی وہ بائیں بازو کی تحریک سے قریب رہے۔ خصوصاً انجمن ترقی پسند مصنفین کے ادباء شعراء کا تعلق نہرو سے بالکل ذاتی سطح پر بھی تھا۔ خواجہ احمد عباس' علی سردار جعفری' کرشن چندر' سجاد ظہیر' عبدالحلیم شرر' سبط حسین اور کیفی اعظمی وغیرہ ایسے حضرات تھے جو نہ صرف ان کی سیاسی حیثیت کے معترف تھے بلکہ ان کی علمی قابلیت اور دانشورانہ صلاحیت کے بھی قائل تھے۔ نہرو ہمیشہ تنگ نظری' ظلمت پسندی' جاگیردارانہ اور رجعت پسندانہ رویے سے لڑتے رہے۔

کیفی اعظمی نہرو جی کے قریب رہے اور براہِ راست ان سے ان کا تعلق بھی رہا۔ لہٰذا ان کے آئیڈیل اور رہنما اصولوں کو انہوں نے قریب سے دیکھا اور سمجھا' کیفی خود بھی بائیں محاذ پر وہی جنگ لڑ رہے تھے۔ ہندوستان کی غلامی سے نجات کی جدوجہد اور آزاد ہندوستان کا وہ روشن تصور ان کے ذہن میں بھی موجود تھا' جس کا اظہار نہرو نے کبھی ہندوستان کے آئین ساز اسمبلی میں کیا تھا۔ کیفی نے نہرو کی شخصیت پر ایک خوبصورت نظم تخلیق کی تھی جس کا عنوان بھی ''نہرو'' تھا۔ نظم ملاحظہ فرمائیں:

''میں تنہا کبھی اس کو دیکھا نہیں
پھر بھی جب اس کو دیکھا وہ تنہا ملا
جیسے صحرا میں چشمہ کہیں
یا سمندر میں مینارِ نور
یا کوئی فکرِ دہام میں
فکر صدیوں اکیلی اکیلی رہی
ذہن صدیوں اکیلا اکیلا ملا''

نہرو کے علاوہ دیگر سیاسی رہنماؤں جنہوں نے کیفی اور ان کے عہد کو متاثر کیا' ان میں ملکی و غیر ملکی لیڈران شامل ہیں۔ مثلاً سبھاش چندر بوس' بھگت سنگھ' بلبھ بھائی پٹیل' مسٹر جناح' لال کپور' موپلا (کسان) پی سی جوشی' سروجنی نائیڈو' لینن اور مارکس وغیرہ۔ کیفی مذکورہ حضرات سے یقیناً ذہنی طور پر

کہیں نہ کہیں متاثر نظر آتے ہیں۔ ان لیڈروں کا تذکرہ انہوں نے اپنی نثر (ذاتی اور سیاسی خطوط) میں بھی کیا' اور نظموں میں بھی۔ چند نظموں سے کچھ مصرعے ملاحظہ ہوں جس میں ان کے نام اور ذکر شامل ہیں:

تھا بھگت سنگھ' خطاوار خطاوار سہی
لال کپور کے غدار تھے غدار سہی
موپلا سے تو کبھی شکوۂ بیداد سنو
(سپردگی)

گاندھی اور جناح ملاقات کی ہمت افزائی کیفی اپنی نظم ''کرن'' میں یوں کرتے ہیں:

ناخدا جوڑ کے سر بیٹھنے والے ہیں ادھر
اور ادھر سانس اکھڑنے لگی طوفانوں کی

رشید' سہگل اور شاہنواز کو پھانسی ہونے والی ہے۔ دوسری طرف پھانسی کی سزا کو منسوخ کرنے کے لئے رحم کی درخواست ہے۔ ایسے میں کیفی کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

ہے تو بیداد' مگر یہ نئی بیداد نہیں
اسی زنجیر میں جکڑے ہوئے کتنے رشید
نام بھی جن کے ہمیں پوری طرح یاد نہیں
چڑھ کے پھانسی پہ اتر آیا ہے سہگل صد شکر
کتنے سہگل اسی پھانسی پہ مگر جھول گئے
ان شہیدوں کا تھا ہر قطرۂ خوں شاہنواز
رفتہ رفتہ جنہیں ارباب وطن بھول گئے

مثنوی ''خانہ جنگی'' میں ٹیپو' نانک' محمد علی' تلک' بھگت سنگھ اور موپلا کسان کے نام بھی شامل ہیں۔
اس کے علاوہ کیفی کی ایک خوبصورت نظم ''لینن'' ہے۔ ایک بند ملاحظہ فرمائیں:

آسماں اور بھی اوپر کو اٹھا جاتا ہے
تم نے سو سال میں انساں کو کیا کتنا بلند
پشت پر باندھ دیا تھا جنہیں جلادوں نے
پھینکے ہیں آج وہی ہاتھ ستاروں پہ کمند

■■■■

ادبی شخصیات

کیفی اعظمی ایک انفرادی شخصیت اور رومانی طبیعت لے کر پیدا ہوئے تھے۔ ان کی شاعری کے حوالے سے گذشتہ ادوار کا چہرہ دیکھا جا سکتا ہے' نیز عصری نشیب و فراز کے ہر پیچ و خم کو بہت قریب سے سمجھا بھی جا سکتا ہے۔ جس سے ان کا کردار بھی مرتب ہو سکتا ہے' ان کی بیشتر نظموں کا روئے سخن وطن کے عوام ہیں۔ لہٰذا وہ ہمیشہ سازشوں کو پہچاننے' ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے اور اپنے کردار سے وطن کا چہرہ سجانے کی تلقین کرتے ہیں۔ کیفی کے عہد کا موجودہ رویہ اطمینان بخش نہیں تھا ہر طرف ایک افراتفری مچی ہوئی تھی' اقدار اور افکار بدل رہے تھے ہر آدمی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ پورا ہندوستان غیر یقینی حالات سے دوچار تھا' لہٰذا ایسے میں تبدیلی کی سخت ضرورت تھی جہاں کیفی کبھی سیاست داں' کبھی شاعر اور کبھی مفکر کی صورت میں حادثات زمانہ کا جائزہ ایک باشعور انسان کی طرح لیتے ہوئے ہمیں نظر آتے ہیں اور صحیح نتائج تک اپنی فکر کی روشنی میں پہنچنے کی سعی کرتے ہیں۔ کیفی کی شاعری ایک صاف گو اور حق پرست انسان کی شاعری ہے۔ ان کی حق پرستی ایک کامیاب شاعر کے ساتھ ہمیشہ ایک عظیم اور دردمند انسان کو بھی ہمارے سامنے کھڑا کر دیتی ہے۔

کیفی کے معاصرین شعراء و ادباء کے سلسلے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے ضروری ہو جاتا ہے کہ جس وقت کیفی نے اپنا شعری سفر شروع کیا' اس وقت کا شعری مزاج کیا تھا اور غالب رجحانات کیا تھے' اس کا پتہ لگایا جائے۔ اس سلسلے میں شارب ردولوی کا یہ اقتباس غالباً ان سوالوں کو حل کر دیتا ہے: [۱۳]

> "کیفی نے جس وقت اپنا شعری سفر شروع کیا' اس وقت نثر و نظم میں رومانویت کا غلبہ تھا' نثر میں ایک طرف مہدی افادی' سجاد حیدر یلدرم کی مرصع نثر تھی دوسری طرف نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری کے رومانی افسانے' شاعری میں جوش کی حسن کاری اور اختر شیرانی' عظمت اللہ خاں' میراں جی اور دوسرے شعراء کی

عشق و محبت اور ناکامی و محرومی میں ڈوبی ہوئی آوازیں تھیں اورہر شخص انھیں آوازوں کا اسیر تھا۔ کہتے ھیں نیاز فتح پوری اور مجنوں کے افسانے پڑھ کر کتنے ھی نوجوانوں نے خودکشی کرلی' مھدی افادی اور یلدرم کے اسلوب کی نقل کی کوششیں عام تھیں۔ سلمیٰ نورا' ناھید اور پروین کی جستجو میں ھر شاعر اور ھر نوجوان دیوانہ تھا۔ اس وقت وھی شاعر کامیاب تھا جو ناکام محبت تھا۔ خیالی بنت مریم شاعروں کے تصور کا مرکز تھی۔"

مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں اس زمانے کے شعراء ادباء کی شاعری کے مزاج اور ادب کے رجحان کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ بات آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ اس وقت کی شاعری پر عشق و عاشقی اور رومانویت کا غلبہ تھا اور اس وقت کا یہ رومانی رجحان بھی کسی تحریک سے کم نہیں تھا۔ لہٰذا اپنے عہد کے اس مقبول رجحان سے کیفی کا متاثر ہونا فطری بات تھی اس لئے کیفی کی ابتدائی شاعری پر رومانویت غالب رہی۔ اس رومانویت کے اسباب' یا اس عہد میں شاعری کے ڈکشن کیا تھے۔ اقتباس سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ بہرحال اس تفصیل میں گئے بغیر کہ کیفی کے ڈکشن کیا تھے یا وہ اپنے ڈکشن کے اعتبار سے اپنے معاصرین میں کس حد تک کامیاب رہے' یہاں پر میں ایک بات واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ کیفی نے بعد میں اپنی شاعری کے لئے جو ڈکشن اپنایا اور ایک احتجاجی شاعر کی حیثیت سے اردو شاعری پر اپنا جو تاثر قائم کیا اس کی اثر انگیزی سے شاید ہی کوئی انکار کرے۔ احتجاجی شاعر کا سب سے بڑا المیہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں موضوعات کے اعتبار سے شعر کہنے ہوتے ہیں' جس کا براہ راست تعلق عوام سے ہوتا ہے اور بہت کم وقت کے لئے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کی شاعری لوگوں کی نگاہ میں ہنگامی موضوعات اور صورتحال کی نعرہ بازی بن جاتی ہے۔ لیکن کوئی فیصلہ صادر کرنے سے پہلے یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اگر وقت کا تقاضا یہی تھا اور وقت کے تقاضے کو پورا کرنے کی خاطر ایک خاص مقصد کے تحت ایسی شاعری کرنی پڑی ہے تو ایسی شاعری کو مطعون کرنا مناسب نہیں ہے' کیونکہ شاعری کا مقصد صرف آہ یا واہ کرنا بھی نہیں ہے۔ اگر واقعی شاعری وقت کی پیمبری ہے اور شاعر وقت کا نقیب ہے تو اس کا یہ پیمبرانہ عمل مستحسن سمجھا جائے گا۔ ہر شاعری سے یہ توقع کرنا کہ وہ صدیوں پر محیط ہو' مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ وقتی اور لمحاتی شاعری کے سلسلے میں ایلیا اہرن برگ نے بڑی اچھی بات کہی:[۱۴]

"ایک ادیب کے لئے یہی ضروری نہیں کہ وہ ایسے ادب کی تخلیق کرے جو مستقبل کی صدیوں کے لئے ہو۔ اسے ایسے ادب کی تخلیق بھی کرنی چاہئے جو صرف ایک لمحے کے لئے ہو اگر اس لمحے میں اس قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔"

اس نہج سے کیفی کی شاعری کا جائزہ لیں تو ان کے ڈکشن کا مقصد بھی سمجھ میں آتا ہے' اور وہ اپنے معاصرین میں بے حد کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری وقت کے اہم تقاضوں کی شاعری ہے۔ انہوں نے ہنگامی موضوعات پر' اور حالات سے متاثر ہو کر بہت ساری نظمیں تخلیق کیں' جنہیں آپ وقتی اور لمحاتی شاعری کہہ کر نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اگر وقت اور حالات فراموش نہیں کئے جا سکتے تو اس سے متعلق ادب بھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔

نظیر اکبر آبادی کو لوگوں نے شروع میں قبول نہیں کیا۔ ان کے ڈکشن کو سطحی اور غیر ادبی کہہ کر نظر انداز کرتے رہے' مگر ایک زمانہ آیا اور نظیر کی اہمیت کا احساس ہوا۔ جب ان کے شعری پیمانوں کی کسوٹی پر ان کی شاعری کا جائزہ لیا گیا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ جو ادب وقت کے تقاضے کو پورا نہیں کرتا' یا اس کا کوئی مقصد ہی نہ ہو تو وہ ادب یا شاعری خواہ کتنی ہی خوبصورت اشارے اور کنائے میں ہو' وہ اپنی حیثیت نہیں منوا سکتی۔ کیفی کی یہ بڑی خوبی ہے کہ انہوں نے وقت کے تقاضے کو مقدم جانا۔ یہ بات مان بھی لیں کہ وقت کے تقاضے پر انہوں نے فن کو قربان کیا ہے' تو وہاں بھی ان کی ہمدردی اور انسان دوستی کا جذبہ ہی کارفرما تھا۔ کیفی نے وقت کو ملحوظ خاطر رکھا اور اپنے فن کو بے وقعت ہونے سے بچالیا۔

کیفی کے معاصرین شعراء میں فیض' مخدوم' سردار' اختر الایمان' جذبی' قاسمی' جاں نثار اختر اور مجروح نمائندہ شعراء ہیں' اور سبھوں نے اپنے مخصوص لب و لہجے سے اپنی حیثیت منوائی' جن کی شاعری کا تاثر آج بھی قائم ہے اور آئندہ بھی قائم رہے گا۔ بے شک ان لوگوں نے اردو شاعری اور اردو ادب کو فکر و فن کے نئے تجربوں سے آشنا اور مالا مال کیا۔ یہ تمام شعراء اردو شاعری کے روشن ستارے ہیں۔ جن کی روشنی آج بھی ماند نہیں پڑی' کیونکہ یہ سب صاحب طرز شاعر ہیں اور سب کی ادبی پہچان مسلم ہے۔ یہ ہم عصر ہونے کے باوجود اپنی حیثیت اور پہچان جداگانہ رکھتے ہیں' جبکہ یہ ایک ہی منزل کی مسافت طے کر رہے تھے۔ لیکن ایک دوسرے سے الگ ہو کر محسوسات اور جذبات کی دنیا الگ بنائی تھی۔ شعور کی ہر سطح پر ان کی انفرادیت قائم تھی۔ ایک ہی موضوع پر ترقی پسند شعراء کے یہاں کئی نظمیں آپ دیکھیں گے' مگر سب کے اسلوب' آواز اور لب و لہجے میں ایک نمایاں فرق بھی محسوس کریں گے۔ کہیں رومانیت' کہیں روایت کی پاسداری' کہیں بغاوت' کہیں نغمگی' کہیں بلند آہنگی' کہیں انقلاب'

کہیں انحراف تو کہیں سرمستی اور یہ تمام نوعتیں ان کی ایک انفرادی شناخت قائم کرتی ہیں۔ لہٰذا تمام ترقی پسند شعراء کی شاعری کو محض چیخ و پکار اور نعرہ بازی سے منسوب کر دینا عصبیت نہیں تو اور کیا ہے؟

مذکورہ باتوں کی روشنی میں اس کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلوب یا لہجہ موضوع تلاش نہیں کرتا' بلکہ موضوع اور اس کی نوعتیں اپنا اسلوب اور لہجہ تلاش کر لیتی ہیں۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر کیفی کے شعری رویوں کو عہد کے تناظر میں سمجھنا آسان بھی ہوگا اور کارگر بھی۔ کیفی کے موضوعات حالات کے دین تھے۔ لہٰذا موضوعات کی توضیح سے ہی ان کے اسلوب اور خطابت آمیز لہجے کا مطلب سمجھ سکیں گے' چونکہ خطابت آمیز اور احتجاجی لب و لہجے سے کیفی کی شناخت قائم کرنے کی کوششیں ہوئی ہیں۔ تو یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ ان کا احتجاج کیوں تھا؟ اور ان کا لہجہ خطابت آمیز کیوں ہوا؟ اس کی تفصیل میں جائیں گے تو معلوم ہوگا کہ ان کا احتجاج وقت کے تقاضوں کا احتجاج تھا' جس سے کیفی نے چشم پوشی نہیں کی چونکہ سخن عوام سے تھا اور موضوع کا فکری تقاضا بھی خطیبانہ ہی تھا۔ لہٰذا موضوع نے خود اپنا لہجہ دریافت کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ کیفی کے یہاں موضوع اور لہجہ میں ایک مناسبت ہے یہ کہیں بے میل نہیں لگتا۔ ویسے بھی خطابت ایک اعلیٰ فن ہے خطابت نثری بھی ہوتی ہے اور منظوم بھی۔ عربی شاعری میں اس لہجے کی بڑی قدر ہے۔

تجربوں کے کئی زینے کیفی کی شاعری نے طے کئے' ابتدائی شاعری رومان سے شروع ہوئی' اس دور کی نظموں میں دکھ درد اور مجبوری کی ایک فضا خلق ہوتی ہے۔ مگر کیفی کا کمال یہ ہے کہ ان کی رومانویت محض تخیلات کی دنیا آباد نہیں کرتی' وہاں بھی ان کا طرز اظہار رومانی حقیقت نگاری کی عمدہ مثالیں پیش کرتی ہیں اور وہاں بھی ان کی باغیانہ روش قائم نظر آتی ہے۔ کیفی نے رومانی دور میں کئی اچھی نظمیں تخلیق کیں' جس کی دلکشی آج بھی قائم ہے اور آنے والے دنوں میں بھی قائم رہے گی۔ کیفی کی رومانی شاعری کا دور بہت مختصر رہا۔ کیفی نے بہت جلد عہد کے تقاضے کو محسوس کر لیا اور جیسے جیسے وہ تقاضوں کے قریب ہوتے گئے' ان کے موضوعات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا گیا۔ ۱۸۵۷ء سے آج تک جتنی اہم سماجی' سیاسی اور تہذیبی تحریکیں ہندوستان میں پروان چڑھیں گرچہ ان کی نوعتیں مختلف تھیں' پھر بھی وہ کیفی کے لئے کہیں پس منظر کا کام کیا تو کہیں ان کی جرأت شوق کو مہمیز کیا۔ مذہب کے چند برگزیدہ شخصیتوں کے علاوہ سیاسی و ادبی شخصیتوں نے بھی کیفی کے شعور کو روشن رکھا۔ لہٰذا اس روشن شعور کی حد بندی آسان نہیں۔ المختصر یہ کہ کیفی اپنے عہد کے تقاضوں کا ایک کامیاب انقلابی شاعر ہے۔

■■■■

حوالہ جات و توضیحات :

۱۔ کیفی تخلص ان کے والد نے دیا۔

۲۔ • انٹرنیشنل انسائیکلو پیڈیا آف انڈین لٹریچر' جلد ہفتم' اردو ۱۹۹۱' میں ۱۹۱۸ درج ہے۔ص ۳۲۲

• 'معیار' کیفی نمبر۔مظفر حنفی نے کیفی کی پیدائش کی تاریخ ۱۹۱۸ء درج کی ہے۔ص ۳۲۶

• اردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔سید احتشام حسین نے کیفی کی پیدائش ۱۹۱۷ء بتائی۔ص ۲۸۴

• تذکرہ ماہ وسال' میں ۱۴ جنوری' ۱۹۲۴ء درج ہے۔

• 'معیار' کیفی نمبر۔خودنوشت۔ص ۲۳ میں کیفی رقم طراز ہیں۔

''تاریخ پیدائش یاد نہیں' تاریخ وفات معلوم نہیں' اپنے بارے میں یقین کے ساتھ صرف اس قدر کہنا ممکن ہے کہ غلام ہندوستان میں پیدا ہوا' آزاد ہندوستان میں جی رہا ہوں اور سوشلسٹ ہندوستان میں مروں گا۔''

• راقم الحروف کی نظر میں اندازے کے مطابق ۱۹۱۸ ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے تاہم یہ مسئلہ اب بھی تحقیق طلب ہے۔

۳۔ پہلا بچہ - ۱۹۴۹ء میں پیدا ہوا اور چند مہینوں کے بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔
شبانہ اعظمی - یہ نام علی سردار جعفری کا رکھا ہوا ہے۔
احمر اعظمی - یہ نام مسعود صدیقی نے رکھا تھا۔

۴۔ 'عکس اور جہتیں'۔ص ۳۵ پر عائشہ صدیقی نے تعلیم کے سلسلے میں لکھا کہ:

''کیفی صاحب کو ان کے بزرگوں نے ایک درس گاہ میں اس غرض سے داخل کیا تھا کہ وہاں یہ فاتحہ پڑھنا سیکھ جائیں گے۔کیفی صاحب اس درس گاہ میں مذہب پر فاتحہ پڑھ کر نکل آئے۔''

کیفی کی تعلیم سلطان المدارس' مدرستہ الواعظین اور اعلیٰ الحکیم لکھنؤ کے مدرسوں میں ہوئی۔

۵۔ 'سہیل' گیا۔ کیفی نمبر' کیفی میرے ہمسفر' شوکت کیفی۔ص ۲۲

۶۔ 'معیار' کیفی نمبر' کیفی کے ابتدائی تخلیقی آئیڈیل محمد حسن' بحوالہ نجابت ادیب۔ص ۴۵۶

۷۔ آج کل' نومبر ۱۹۸۹۔ جواہر لال نہرو۔ڈی آر گوئل۔ص ۱۳

۸۔ آج کل' نومبر ۱۹۸۹۔ جواہر لال نہرو۔رویندر کمار۔ص ۸

۹' ۱۰۔ 'حصار' سہ ماہی' رانچی' حلقہ ارباب ذوق۔وزیر آغا۔ص ۴۰

۱۱' ۱۲۔ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر۔تحریک جمالیات اور سیاست۔علی سردار جعفری۔ص ۵۹-۶۲

۱۳۔ 'معیار' کیفی نمبر۔کیفی کا شعری سفر۔شارب ردولوی۔ص ۱۶۶

۱۴۔ 'معیار' کیفی نمبر' آخر شب کا ہمسفر' بحوالہ نامی انصاری۔ص ۳۸۰

احتساب

- رومانی نظمیں
- سیاسی نظمیں
- فلمی نغمے

انتساب

پروفیسر جابر حسین کے نام

حسین رات
اور نرم بستر سے دور
تمہاری نیند سے بوجھل پلکیں
نہ جانے کتنی رات جاگتی رہیں
اور تمہارے
رواں قلم کی اذیت سے
تمہاری انگلیاں فگار ہوتی رہیں
اور تم
پسماندہ قوم
اور استحصال زدہ عوام کی
ایک زندہ تاریخ لکھتے رہے

■

■ رومانی نظمیں

اردو شاعری اپنے مزاج کے اعتبار سے رومان پرور ثابت ہوئی ہے' چونکہ شاعری کا ایک بڑا حصہ اسی رومانی افکار سے متاثر نظر آتا ہے۔ غزلیہ شاعری کے مطالعے سے ہی اس کی تصدیق ہو جائے گی۔ عشق و عاشقی کے نکات اور اس سے متعلق تمام تفصیلات و تاویلات عموماً اردو شاعری کا مزاج اور موضوع رہا ہے۔ عشق و محبت' ناکامی و محرومی اور ہجر و وصال کی لذت سے کبھی اردو شاعری خالی نہیں رہی' ہاں اس کے موضوعات اور برتاؤ میں یقیناً تبدیلی واقع ہوتی رہی ہے' اس طرح اس کا رشتہ نہ صرف رومان سے بلکہ سماجی سروکار سے بھی استوار ہوتا گیا۔

کیفی کی شاعری کی افہام و تفہیم یا اسے عہد بہ عہد سمجھنے کے لئے یہ کوشش بارآور ہوگی کہ ان کی شاعری کے تجزیئے سے شعری نکات کے بیشتر پہلو روشن ہو جائیں اور ان کی شاعری کے جواز کا ایک واضح مطلب بھی سامنے آئے۔ اس کے لئے ان کی شاعری کو ادوار میں تقسیم کر کے دیکھا جائے' تو یہ مسئلہ آسان ہو سکتا ہے۔ یہاں پر اس بات کی وضاحت بھی کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مظفر حنفی نے اپنے مضمون 'کیفی اعظمی مثلث کا تیسرا زاویہ' معیار کیفی نمبر ص: ۳۳۶ میں ادوار کا تعین یوں کیا ہے (از ابتداء تا ۱۹۴۵ تا ۱۹۶۲ تا حال) چونکہ کیفی کی تاریخ پیدائش' خود کیفی کو معلوم نہیں لیکن جناب حنفی نے ۱۹۱۸ درج کر کے اپنے طور پر ادوار کی تقسیم کی ہے۔ تاویلات و تفصیلات بھی تقریباً مبنی بر قیاس ہیں۔ اس لئے مظفر حنفی کے تعین ادوار سے کلی طور پر اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے کیفی کے مجموعہ ہائے کلام کی سن اشاعت اور شعری مزاج کو ہی لائق اعتنا سمجھا ہے' لہٰذا میرے نزدیک ادوار اور سن کے اعتبار سے ان کی شاعری یوں ترتیب پاتی ہے۔

پہلا دور	رومانی و طبقاتی دور	از ابتداء	تا	۱۹۴۳
دوسرا دور	انقلابی و اشتراکی دور	۱۹۴۳	تا	۱۹۷۳
تیسرا دور	امکانی و امتزاجی دور	۱۹۷۳	تا	حال

پہلا دور : اس دور کا غالب رجحان رومان کا تھا' ادب اور ادیب دونوں اس سے متاثر تھے۔

مقفیٰ و مسجع نثر کا چلن عام تھا' لہٰذا افسانوی ادب بھی اس رجحان سے بہت قریب ہو چکا تھا۔ شاعری میں سلمیٰ' سلطانہ' نوریٰ اور ناہید وغیرہ کی محبت اور جستجو اس قدر حاوی تھی کہ ہر شاعر خود کو ناکام محبت ثابت کر کے شاعری کی معراج پالینا چاہتا تھا۔ اسی دور کی رومانویت میں ایک عنصر بغاوت کا بھی شامل نظر آتا ہے۔ ایک طبقہ فن کے روایتی اصول وضوابط سے' معاشرے کے قید و بند اور روایت کے فرسودہ نظریات سے بغاوت و انحراف پر آمادہ تھا۔ لہٰذا رومان سے بغاوت کی طرف پیش قدمی کا یہ دور کئی سطحوں پر ادب کو متاثر کر رہا تھا۔

دوسرا دور: یہ دور ہندوستان کی غلامی اور آزادی کے درمیان زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب کا دور تھا۔ اشتراک و انقلاب اس دور کے اہم تقاضے تھے' لہٰذا ادب پر اس کے گہرے اثرات مرتسم ہوئے۔ کیفی کے یہاں اس اشتراک و انقلاب کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

تیسرا دور: یہ دور کیفی کا امتزاجی اور امکانی دور کہا جاسکتا ہے' چونکہ اس عہد کی شاعری میں رومان' اشتراک اور انقلاب ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے تجربوں کی منزل سے گزر کر مقتضائے وقت کے ممکنات کو روشن کرتے ہیں۔

کیفی کی ابتدائی شاعری بھی اسی رومان اور عشق و محبت کی ذاتی واردات سے شروع ہوتی ہے۔ جن میں رومانی لمحات و کیفیات کی کارفرمائی ہے۔ جہاں محبوب سے متعلق محسوسات کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ کیفی کی رومانی شاعری میں بھی ایسی ہی ایک دنیا خلق ہو کر سامنے آتی ہے۔ کیفی نے جب شعر کہنا شروع کیا تو اس وقت اردو فکشن اور شاعری میں رومانیت کا خاصا اثر تھا۔ اس عہد کے شعری یا نثری ادب کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ اس وقت کی بڑی اور معتبر آوازیں بھی ناکام محبت کی محرومی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ حقیقی یا خیالی لیلیٰ کی محبت میں جو دیوانگی سامنے آئی تھی' وہ اپنے عہد کے اس رجحان کو ایک تحریک میں بدل دیا تھا۔ لہٰذا اس مقبول رجحان سے کسی کا متاثر ہو جانا غیر فطری نہیں تھا۔ کیفی اس رجحان سے متاثر ضرور ہوئے' مگر اپنی شاعری پر اس درجہ رومانی جنون کو حاوی نہیں کیا کہ' بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ' کے مصداق دیوانہ کہلائیں۔ ان کی شاعری میں اوروں کی طرح ناکامی' محرومی اور ویرانی سب کچھ موجود ہے' جو اس وقت کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا' جسے لوگ فیشن کے طور پر قبول کر کے خود کو سب سے درد کا مارا شاعر بنا کر اپنی شاعری کو قنوطی بننے پر مجبور کر رہے تھے۔ لیکن کیفی کی شاعری میں ایسا کوئی معاملہ سامنے نہیں آتا جو انہیں قنوطی بننے پر مجبور کرتا۔ ان کی شاعری میں نہ تو ایسی ناکامی ہے' نہ محرومی' اور نہ ہی ایسی کوئی ویرانی جہاں پہنچ کر لوگ حواس باختہ ہو کر خواہ مخواہ مجنوں بن جاتے اور

خیالی لیلیٰ تخیل کی پہلی سے گزر لیتے ہیں۔ کیفی اس طرح کی ناکامی اور محرومی سے انحراف کرتے ہیں اور یہی انحراف ان کے یہاں توازن کے ساتھ سچی محبت کا بھرم بھی قائم رکھتا ہے۔ جس طرح کیفی اپنی سماجی و سیاسی شاعری میں ایک سچے فنکار کی طرح حقیقت کے قریب نظر آتے ہیں' اسی طرح وہ اپنی رومانی شاعری میں بھی کسی سراب صحرا کی مانند فریب نظر نہیں ہوتے۔ ان کی محرومیوں اور ناکامیوں کا غم اوڑھا ہوا نہیں بلکہ بھوگا ہوا ہے' جہاں احساسات و جذبات کی زیریں لہروں میں ان کی تڑپ' خلش' بے چینی' رنج و غم اور خوشیاں سب کچھ منکشف ہو جاتی ہیں۔

کیفی کی نظموں میں بیداری کا احساس مدھم سروں میں جادو جگاتا ہے۔ رومانی اور سیاسی نظموں میں تاثیریت کی جو شدت ہے وہ مختلف سمت میں بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ رومانی نظموں میں جہاں نرمی' شگفتگی اور شبنمی شدت ہے' وہ ان کی آواز کو نہایت مدھم اور مترنم بنا دیتی ہے۔ لیکن سیاسی و سماجی نظموں میں ولولہ' خطابت اور بلند آہنگی کی شدت اس آواز کے سر کو بلند کر دیتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ موضوع اور محل کے اعتبار سے ان کی شاعری میں اسی قبیل کے الفاظ بھی استعمال ہوتے چلے جاتے ہیں' جس سے حسن یا طرز آہنگ میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ کیفی ہر جگہ اپنے عشق کی حرمت کا لحاظ رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کے یہاں کہیں بھی اپنے محبوب سے چھل اور شاعری سے فریب کا منظر سامنے نہیں آتا' ان کی نظموں میں عاشق کا چھلاوا نہیں ہے' پوری رومانی شاعری کے تجزیئے میں کوئی مصنوعی عاشق اور خیالی لیلیٰ نظر نہیں آتی' محبوب کی قربت ہو کہ فرقت' ہجر ہو کہ وصال' وفا ہو کہ جفا ہر جگہ یہ جزئیات اپنی حقیقی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں' جو ان کے دکھ اور سکھ کے آئینہ خانے کو مصنوعی نہیں بننے دیتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں رونے دھونے کی وہ کیفیت نہیں ملتی جو دوسرے شعراء کے یہاں عموماً پائی جاتی ہے۔

رومان کی جو بھی تعریف ہو' اس سے قطع نظر عموماً رومانی شاعری کا مرکزی موضوع یا خیال' عورت اور حسن سے ہی متعلق ہوتا ہے۔ خواہ اس میں اس کا سراپا بیان ہو یا اس کی تفصیلات بتائی جائے' اس کی وفا کا دم بھرا جائے یا اس کی بے وفائی کے شکوے کئے جائیں' وصال یار کی باتیں ہوں یا فرقت جاناں کے قصے رقم ہوں یا دیگر جزئیات بیان کئے جائیں' رومان اسی محور کے اردگرد چکر کاٹتا ہے۔ عورت کے تصور کا اردو شاعری میں اگر آپ جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اردو کے بیشتر شعراء کے یہاں عورت محض تسکین کا سامان بن کر ہی سامنے آئی۔ قدیم شاعری اس طرح کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ جہاں عورت کے حسن سے خوب کھیلا گیا' اس کے سراپے سے خوب مستی کی گئی' اس کے تقدس کی پرواہ کئے بنا اس کے عضو کے ایک ایک بل پر اور ابھار کے ایک ایک خطوط پر تذکرے کئے گئے' غزل کے نام پر فن کا

بہت سستا اظہار اردو شاعری میں ہوا' اور زمانے تک ہوا۔ کچھ ایسے شعراء بھی اردو شاعری میں آپ کو مل جائیں گے' جن کو اس صنف کا دامن بھی اس سستے اظہار کے لئے کم معلوم ہوا تو ریختی کے نام پر عورت سے مشابہ ایک خیالی مخلوق کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور پھر اس کے بدن سے بھی ایک ایک کر کے تمام کپڑے ہٹا دیئے گئے اور اسے بے وقعت کرتے ہوئے سر بازار نیلام کر دیا گیا۔ عورت کی محکومی و محرومی یا مرد کے ہاتھوں عورت کے استحصال کی یہ کہانی نئی نہیں ہے۔ آج بھی عورت خود کو اس حصار سے باہر نہیں نکال پائیں' کل اور آج میں صرف استحصال کا طریقۂ کار بدل گیا ہے۔

اس گفتگو کے بعد کسی کا یہ سمجھ لینا بھی غلط ہوگا کہ مذکورہ باتیں پوری اردو شاعری پر صادق آتی ہیں' ایسا نہیں ہے۔ پوری اردو شاعری پر یہ الزام لگایا بھی نہیں جا سکتا' کیونکہ اردو شاعری کا ایک حصہ ایسا ضرور ہے جہاں عورت کی پاکیزگی' اس کی حرمت اور اس کا تقدس اردو شاعری کا موضوع بنا' جہاں عورت کوچہ و بازار کی کوئی شئے بن کر نہیں بلکہ ایک مریمی صفت کے ساتھ تقدس مآب شئے بن کر سامنے آتی ہے۔ عورت سے متعلق فحاشی کے اس باب کو ختم کرنے میں حالی' مومن' اکبر اور محمد حسین آزاد جیسے شعراء و ادباء کے علاوہ ترقی پسندوں نے بھی اس جانب توجہ دی اور عورت کی پاکیزگی' اس کی حرمت و عصمت اور اس کے تصورات کو کچھ اس انداز سے پیش کیا کہ عورت کا وہ روحانی رشتہ' جسم کے حصار سے باہر آ گیا' جو عورت کو باوقار بناتا ہے۔

آپ کیفی کی شاعری کا مطالعہ کریں تو یہ ضرور محسوس ہوگا کہ ان کی شاعری میں عورت محض جنسی تکمیل کا وسیلہ نہیں بلکہ اس نظام حیات کا ایک مضبوط سہارا بن کر سامنے آتی ہے۔ عورت کے تقدس سے متعلق جو کیفیتیں ان کی رومانی شاعری میں ابھرتی ہیں وہ عورت کی عظمت اور اہمیت کو بہت بلند کر دیتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی رومانیت میں روحانیت اور عرفانیت شامل ہوگئی ہے۔ جب اپنی نظم 'سروجنی نائیڈو' میں وہ یہ کہتے ہیں تو یہ باتیں کسی ایک عورت کے لئے مخصوص نہیں ہوتیں بلکہ وہ تمام عورت سے متعلق اس کے وجود کا ایک روحانی اور عرفانی تصور بھی سامنے لاتا ہے۔

ذرا زمین کو محور پہ گھوم لینے دے
سماج تجھ سے ترا سوز و ساز مانگے گی
جمال سیکھے گا خود اعتمادیاں تجھ سے
حیات نو ترے دل کا گداز مانگے گی

یا پھر نظم 'حوصلہ' میں جب یہ خیال پیش کرتے ہیں:

تو خورشید ہے بادلوں میں نہ چھپ
تو مہتاب ہے جگمگانا نہ چھوڑ
تو شوخی ہے، شوخی رعایت نہ کر
تو بجلی ہے، بجلی جلانا نہ چھوڑ
ابھی عشق نے ہار مانی نہیں ہے
ابھی عشق کو آزمانا نہ چھوڑ

کیفی کی شاعری میں عورت اور محبوب کا ایک ایسا تصور سامنے آتا ہے جو اس کے نسوانی کردار کو ایک عجیب وغریب عزم واستقلال سے ہمکنار کرتا ہے۔ یہ وہی تصور ہے جو زندگی کو صبر اور جبر کے قابو سے باہر نکال کر مسلسل جہد وعمل کے لئے آمادہ کرتا ہے اور عورت کو اس کے ہونے کا سبب بتاتا ہے، کہ تم محض ایک دلچسپ کہانی نہیں ہو، ایک حقیقت بھی ہو، تمہارے پاس صرف تمہاری جوانی نہیں ہے، ایک مکمل وجود بھی ہے اور اس وجود کی اپنی ایک تاریخ بھی ہے، جس کے عنوان کو تمہیں بدلنا ہوگا۔ تمہیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ تمہارے اندر صرف اشک فشانی کی صفت نہیں، بلکہ تم صفت شعلگی سے بھی متصف ہو۔ تمہیں مرد کے پہلو سے نکل کر اپنے وجود کا احساس دلانا ہوگا، اس کے لئے تمہیں بند قدامت سے نکل کر ان بتوں کو بھی توڑنا ہوگا، جو تمہیں ضعف عشرت اور وہم نزاکت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ تمہیں نفس کی بیڑیوں کو کاٹ کر حلقہء عظمت اور محبت سے بھی نکل آنا ہوگا۔ تمہیں ہر وہ زنجیر کاٹ دینی ہوگی جو عزم شکن ہوگی۔

کیفی ایک پر اعتماد لہجے میں ان کے حوصلوں کو بلند کرتے ہوئے، جب یہ کہتے ہیں کہ 'اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے، بن کر طوفان چھلکنا ہے، ابلنا ہے تجھے، راہ کا خار ہی کیا گل بھی کچلنا ہے تجھے، لڑکھڑائے گی کہاں تک کہ سنبھلنا ہے تجھے، اٹھ مری جان! میرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے، تو وہ مجاز سے بہت آگے نکل جاتے ہیں، کیونکہ وہ مجاز کی طرح آنچل کو صرف پرچم بنا لینے کی بات کہہ کر خاموش نہیں ہو جاتے بلکہ عورت کی ہستی اور اس کے مکمل وجود کو ہی وہ پرچم کشا بنا کر اس کے وقار کا پرچم اتنا بلند کر دیتے ہیں کہ ہر آنچل چھوٹا پڑ جاتا ہے۔ نظم 'عورت' سے دو بند ملاحظہ ہو:

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبض ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں
اڑنے کھلنے میں ہے نکہت خم گیسو میں نہیں
جنت اک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں

اس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

توڑ کر رسم کے بت بند قدامت سے نکل
ضعف عشرت سے نکل وہم نزاکت سے نکل
نفس کے کھینچے ہوئے حلقۂ عظمت سے نکل
قید بن جائے محبت تو محبت سے نکل

راہ کا خار ہی کیا گل بھی کچلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

کیفی کی شاعری میں جب حسن و جمال سے باتیں ہوتی ہیں' یا اس کا سراپا بیان ہوتا ہے' تو کہیں بھی لفظ کا کوئی پھوہڑ پن سامنے نہیں آتا' اور نہ ہی محبوب کی قربت میں کوئی ایسی لذت کوشی نظر آتی ہے' جو اسے فحاشی کے قریب لے جائے۔ پوری شاعری میں عورت کے وقار کا ایک خاص لحاظ نظر آتا ہے اور بہت محتاط انداز میں قربت اور وصال یار کی باتیں ہوتی ہیں' جہاں نہ صرف عورت بلکہ مرد کی پاکیزگی بھی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ نظم 'تصور' میں محبوب کا سراپا جس انداز میں بیان ہوا ہے' وہاں محبوب کے جسمانی خطوط اور ابھار کا ذکر نہیں ملتا' بلکہ نقش و نگار سے متعلق اس کے حسن و جمال کا تذکرہ ملتا ہے۔ جو جسم کے خال و خد کو پردے میں رکھ کر اس کے سراپا حسن کو ظاہر کر دیتا ہے۔ حسن کی تفصیلات کے ساتھ' احتیاط کا انداز ملاحظہ فرمائیں:

یہ جسم نازک' یہ نرم بانہیں' حسین گردن' سڈول بازو
شگفتہ چہرہ' سلونی رنگت' گھنیرا جوڑا' سیاہ گیسو
نشیلی آنکھیں' رسیلی چتون' دراز پلکیں' مہین ابرو
تمام شوخی' تمام بجلی' تمام مستی' تمام جادو
ہزار جادو جگا رہی ہو
خواب کیسا دکھا رہی ہو

نہیں محبت کی کوئی قیمت' جو کوئی قیمت ادا کرو گی
وفا کی فرصت نہ دے گی دنیا ہزار عزم وفا کرو گی
مجھے بہلنے دو رنج و غم سے سہارے کب تک دیا کرو گی
جنوں کو اتنا نہ گدگداؤ پکڑ لوں دامن تو کیا کرو گی

قریب بڑھتی ہی آ رہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

شاعری کا منصب کیا ہے؟ اس کا احساس کیفی کو بہت جلد ہو گیا تھا' شاید اسی لئے ان کے یہاں رومانی شاعری کا زمانہ بہت کم رہا۔ وقت کے تقاضوں نے ہی انہیں رومان سے بغاوت اور احتجاج کی طرف آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کی شاعری میں احتجاج اور بغاوت فیشن کے طور پر نہیں آئی۔ کیفی کا عہد ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ بہت دیر تک رومان کے سایے میں لب و رخسار کی باتیں نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے حالات کی نزاکت اور شعری منصب کو بڑی ایمانداری سے سمجھنے کی سعی کی ہے اور بہت ذمہ داری کے ساتھ ان کے تقاضے پورے کئے ہیں۔

کیفی کے یہاں رومان اور بغاوت کی ملی جلی کیفیت ان کی کئی نظموں میں آپ محسوس کریں گے۔ جہاں رومان کا رشتہ سماجی و سیاسی سروکار سے استوار ہوتا ہوا نظر آئے گا۔ اس سلسلے کی بہترین نظم 'آواز کی شکست' ہے' جہاں ایک طرف اس کی محبت حائل ہے اور ایک طرف تقاضا سامنے کھڑا آواز لگا رہا ہے۔ محبت بار بار اس سپاہی کا راستہ اپنی محبت کی دہائی دے کر روک لینا چاہتی ہے اور سپاہی وطن کے جذبے سے سرشار ہو کر اس مقتل کی طرف آگے بڑھ رہا ہے جہاں جان گنوانی پڑتی ہے۔ پوری نظم ایک عجیب و غریب کیفیت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ آپ اسے رومان اور بغاوت کی بہترین تمثیل کہہ سکتے ہیں۔ محبت اور فرض سے متعلق چند اشعار ملاحظہ ہوں:

آواز: میں جانے نہ دوں گی میں جانے نہ دوں گی
جدائی کو نزدیک آنے نہ دوں گی
بڑے چاہ والے بڑے پیار والے
مجھے کر چلے سوزِ جاں کے حوالے
نہیں آگ دل میں لگانے نہ دوں گی
میں جانے نہ دوں گی میں جانے نہ دوں گی

سپاہی: الٰہی الٰہی یہ کیا ماجرا ہے
یہ کس کی ضدیں ہیں یہ کیسی صدا ہے
یہ دامن سے لپٹی ہے کس کی دہائی
کہ تھرا رہا ہے وطن کا فدائی

کسی اور کی یہ صدا آ رہی ہے
کہ خود میری کمزوری بہکا رہی ہے
یہ کیا خامیاں اپنے ہی عزم کی ہیں
جو آواز بن کر مجھے روکتی ہیں

راہِ محبت میں زمانے کی ستم ظریفیاں، مجبوریاں اور محبوب کی بے وفائیاں شامل ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی محبت کرنے والوں کو بہت کٹھن مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے اور دشواریاں بھی اٹھانی پڑتی ہیں۔ ایسے کٹھن مرحلوں میں کیفی کی آواز اپنے احساسات و جذبات کی ایسی ترجمانی اور مصوری کرتی ہے کہ ایک ایک کر کے کیفیات کی وہ ساری گرہیں کھل جاتی ہیں، جس کا تعلق ہمارے حواس سے ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر کیفی کی آواز غم جاناں میں ڈوب تو جاتی ہے، مگر لمحہ بھر میں ہی وہ آواز غم زمانہ کے ساتھ پھر ابھر آتی ہے۔ کیفی کی شاعری میں گھٹن کا احساس نہیں ہوتا۔ رجائی لب و لہجے میں وہ اپنے کرب کا اظہار کچھ اس انداز میں پیش کر دیتے ہیں کہ سکوتِ شب کے نغموں میں ہر ایک ذرّہ تھرک اٹھتا ہے۔ 'احتیاط' اور 'اخفائے محبت' سے بالترتیب دو دو بند ملاحظہ فرمائیں:

اب تم آغوشِ تصور میں بھی آیا نہ کرو
چھوٹ جانے دو جو دامان وفا چھوٹ گیا
کیوں یہ لغزیدہ خرامی یہ پشیماں نظری
تم نے توڑا تو نہیں رشتہ دل ٹوٹ گیا

اب تم آغوشِ تصور میں بھی آیا نہ کرو
میری آنکھوں سے یہ رخسار نہ کمہلا جائیں
ڈھونڈتی ہوگی تمہیں اس میں نہاتی ہوئی رات
جاؤ کلیاں نہ کہیں سیج کی مرجھا جائیں

دل بھی ہے دل میں تمنا بھی ہے
کچھ جوانی کا تقاضا بھی ہے
تم کو اپنے پہ بھروسا بھی ہے

جھینپ کر آنکھ ملاتی کیوں ہو؟
تم محبت کو چھپاتی کیوں ہو؟

آؤ اب ہنسنے کی فرصت ہی نہیں
اور بھی کام ہیں الفت ہی نہیں
ہے یہ خامی بھی ندامت ہی نہیں

ڈر کے چلمن کو گراتی کیوں ہو؟
تم محبت کو چھپاتی کیوں ہو؟

کیفی کی رومانی و سیاسی نظموں میں ان کی انا کو بڑا دخل ہے۔ نہ وہ سیاسی نظموں میں اپنے ضمیر کا سودا کرتے ہیں نہ رومانی نظموں میں۔ ہر اس جگہ جہاں قوم کے مفاد کا یا اپنے ضمیر کا معاملہ ہوتا ہے۔ وہاں وہ کسی غیر یقینی صورت حال یا مجبوری سے سمجھوتہ کر کے اپنی انا کو مجروح نہیں کرتے۔ اس کے لئے انہیں بھاری قیمت بھی چکانی پڑتی ہے اور پریشانی کے ساتھ خطرے بھی مول لینے پڑتے ہیں۔ کیفی اپنے عشق میں نہ حد سے تجاوز کرتے ہیں، نہ حد سے نیچے آ کر محبت کا دم بھرتے ہیں۔

لہٰذا یہ اپنی محبت میں صرف عاشق ہی نہیں، ایک پروقار مرد بھی نظر آتے ہیں۔ یہ محبوب کی جدائی کو عام عاشق کی طرح اس کی بے وفائی نہیں سمجھ لیتے، بلکہ اس کی مجبوریوں کے حوالے سے اس کا تجزیہ کرتے ہیں اور اپنی محبت کو رسوا ہونے سے بچا لیتے ہیں۔ ان کی محرومی اور ناکامی کی ایک الگ نوعیت ہے۔ جہاں محبوب کی بے وفائیاں نہیں، اس کی مجبوریاں اور زمانے کی ستم ظریفیاں ہی سامنے آتی ہیں۔ 'اندیشے' اور 'پشیمانی' اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ 'پشیمانی' کے اشعار تحریر کر چکا ہوں لہٰذا 'اندیشے' سے دو بند دیکھیں:

جھک گئی ہوگی جواں سال امنگوں کی جبیں
مٹ گئی ہوگی للک ڈوب گیا ہوگا یقیں
چھا گیا ہوگا دھواں گھوم گئی ہوگی زمیں
اپنے پہلے ہی گھروندے کو جو ڈھایا ہوگا

بے محل چھیڑ پہ جذبات ابھر آئے ہوں گے
غم پشیمان تبسم میں ڈھل آئے ہوں گے
نام پر میرے جب آنسو نکل آئے ہوں گے
سر نہ کاندھے سے سہیلی کے اٹھایا ہوگا

اس طرح کی کئی نظمیں کیفی کے یہاں ملیں گی، جہاں سوزش جاں اور شکست ارماں، مجبوریاں اور زمانے کی ستم ظریفیاں، رخِ حیات سے اس طرح پردہ اٹھاتی ہیں کہ عورت اور مرد دونوں کے تقدس

بحال ہو جاتے ہیں۔ نیز رومان اور بغاوت بھی تڑپ کر ایک دوسرے کی گردن میں کچھ اس انداز سے بانہیں ڈال دیتی ہے کہ حیات کے کئی پہلو جگمگا اٹھتے ہیں۔

کیفی کے یہاں ایسی نظموں کی کمی نہیں ہے۔ جہاں رومان کے ساتھ ساتھ پورا سماج اور معاشرہ چلتا ہے، جہاں ایک دیا سرراہ عمل جل اٹھتا ہے اور امیدوں کا اجالا شیشۂ دل پر برستا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس قبیل کی نظموں کے صرف عنوان پر ہی اکتفا کروں گا۔ نغمگی، عورت، تجدید، ایک بوسہ، عادت، دائرہ، نذرانہ اور اجنبی وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جہاں شبنم کی اشک فشانیاں بھی ہیں اور شعلے کی چنگاریاں بھی جو ہمیں یہ پیغام تو دے ہی جاتی ہیں کہ

اپنی چوکھٹ پہ سجا لے جو تیرے کام کے ہوں

■

دارو رسن سے پہلے

۱۹۸۵ء میں رانچی یونی ورسٹی سے ایم اے اردو فرسٹ کلاس سے پاس کرنے کے بعد میری خواہش تھی کہ میں پی ایچ ڈی کروں۔ میرے سامنے اس وقت ایک بڑا مسئلہ موضوع کے انتخاب کا تھا۔ مجھے ڈاکٹر ش اختر نے کیفی اعظمی کی شاعری پر تحقیقی مقالہ لکھنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ وہ ترقی پسند ادب کے اچھے اور بڑے فنکار ہیں۔ میں کیفی اعظمی کو ادب کے حوالے سے کم اور فلموں کے حوالے سے زیادہ جانتا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ کیفی پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ادب کا ایک بڑا اور نیا کام کریں گے۔ اس وقت تک کیفی کی شاعری پر کسی نے کام نہیں کیا تھا اور کسی یونی ورسٹی میں کوئی تحقیقی مقالہ بھی جمع نہیں ہوا تھا۔ میں نے جب مقالہ لکھنے پر اپنی رضامندی ظاہر کر دی تو مسئلہ گائیڈ کا سامنے آیا۔ انہوں نے ہی ڈاکٹر صدیقی مجیبی کو میرا گائیڈ بنا دیا۔ صدیق مجیبی اردو اکادمی (بہار) کے وائس چیرمین ہو کر پٹنہ چلے آئے' اتنا ہی نہیں پہلی کارمدت پوری ہونے کے بعد' وہ دوسری بار بھی منتخب کر لئے گئے۔ اس طرح مقالے کا کام متاثر ہو گیا۔ کچھ اپنی بھی لاپرواہی رہی' لیکن اس وقت تک میں کیفی صاحب کی شاعری کا نہایت سنجیدگی سے مطالعہ کر چکا تھا۔

کیفی صاحب پر مواد کے نام پر 'سہیل' گیا، کا کیفی نمبر اور ایک دو مضامین کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں تھا' مضامین زیادہ لکھے بھی نہیں گئے تھے۔ ہاں مقالہ لکھنے کے دوران 'معیار' کا کیفی نمبر آ چکا تھا۔ بہرحال پانچ سال کا وقفہ یونہی گذر گیا' مجھے دوبارہ رجسٹریشن کرانا پڑا اور گائیڈ بھی بدلنا پڑا۔ گائیڈ اس بار خود ش اختر ہوئے۔ مقالہ کے آغاز سے انجام کے درمیان ان کے ساتھ میری تین چار نشستیں ہوئیں اور بہت کم وقت میں' میں نے مقالہ تیار کر لیا اور ۱۹۹۳ میں مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل گئی۔ اس کے بعد میں نے کیفی اعظمی کو خط کے ذریعہ اس کی اطلاع دی' ان کا جواب اور مبارکباد کا پیغام تو آیا' لیکن انہوں نے اس تشویش کا اظہار کیا کہ کہیں یہ تحقیقی مقالہ بھی اور مقالوں کی طرح مکھی پہ مکھی بٹھانے جیسا تو نہیں ہے۔ یہ بات مجھے کچھ بری لگی' کیونکہ میں نے مقالے پر محنت کی تھی۔ میں نے پھر کبھی کیفی صاحب کو خط نہیں لکھا۔ دو سال بعد ان کا خط آیا کہ لکھنؤ کے مشاعرے میں ایک دو صاحب سے میں

■■ سیاسی نظمیں

سماجی اور اقتصادی نظام سے ہی سیاسی نظام وجود میں آتا ہے' بہ الفاظِ دیگر سماج کے بغیر سیاست کا تصور ممکن نہیں۔ کیفی کا شعری رویہ بھی اسی سماجی' اقتصادی اور سیاسی نظام کی ناہمواری اور بے ضابطگی کے کرب سے جلا پاتا ہے۔ کہیں یہ فرسودہ روایت سے بغاوت کی شکل میں سامنے آتا ہے تو کہیں سماجی و سیاسی ریاکاری سے احتجاج کی شکل میں۔

کیفی کے اس رویے میں دو باتیں وضاحت سے ملتی ہیں۔ ایک تو انسانیت کش رویوں اور قدروں سے ان کی نفرت اور دوسری غیر متوازن افکار و احوال میں تبدیلی کی خواہش۔ کوئی حساس شاعر اپنے عہد کے حالات اور تقاضوں سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ کوئی تخلیق اگر وقت کے اہم تقاضوں کو پورا نہیں کرتی تو پھر اس تخلیق کا جواز کیا ہے؟ اگر کسی شاعر کا تخلیقی جواز صرف اور صرف فنی لوازمات یا شعری تقاضوں کو پورا کرنا ہے' یا محض آہ اور واہ کی حد تک محظوظ ہونا اور محظوظ کرنا ہے' تو یہ تخلیق کا بہت کمزور جواز ثابت ہوگا۔ کیونکہ ادب ہوا میں معلق نہیں ہوتا' ادب کا تعلق انسان اور انسان کی زندگی سے ہے یا یوں کہیں کہ نہ صرف اس کی ذات بلکہ اس کی پوری کائنات سے ہے' جس کی ترجمانی ادب کا مسلک بھی ہے اور مقصد بھی' اگر یہ ادب اپنے مسلک اور مقصد ہی سے ہٹ جائے تو پھر اس کا جواز ہی کیا رہ جائے گا؟

مجھے ادب یا شاعری کے فکری و فنی لوازمات' اس کے تقاضے یا اصول و ضوابط سے انکار نہیں' مگر اس اصول کا منکر ضرور ہوں' جہاں ادب یا شاعری کے موضوعات پر ضابطہء اخلاق یا تحدیدات نافذ کردئے جائیں۔ کسی کی شاعری میں اگر فلاحی اور اصلاحی نکات ہیں تو ان کی گردن پر تنقید کی اصلاحی چھری چل جائے گی' کسی کی شاعری میں مذہبی اور سیاسی گفتگو ہوئی ہو تو نقاد حضرات وہاں پروپگنڈہ اور تبلیغ کی چھری چلا دیں گے' اگر فلسفیات و نظریات کی بات کریں تو تنقید نظریاتی چھری سے گردن مار دے گی' تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ادب یا شاعری میں کیسی بات ہو' اور کس کی بات ہو؟ شعری تقاضوں اور نزاکتوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے واضح' روشن اور دوٹوک بات کرنا عیب ہے یا ہنر؟ اگر یہ عیب ہے تو پھر ہنرمندی کیا ہے؟

ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ادب زندگی سے عبارت ہوتا ہے اور زندگی ہمیشہ مسائل سے دوچار

ہوتی ہے اور یہ مسائل کبھی ایک محور پر قائم نہیں رہتے' ہمیشہ محور بدلتے رہتے ہیں۔ اب یہ اس کی بصیرت پر منحصر ہے۔ اس پر قدغن لگانا مناسب نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی فنکار ہر مسئلے کو ہر زاویئے سے نہیں دیکھ سکتا۔ فنکار اپنے لئے کوئی ایک نقطہ یا زاویہ تلاش کرتا ہے اور اسی نقطے سے ایک دائرہ وجود میں لاتا ہے' اب اس دائرے کی محدودیت اور لامحدودیت بھی فنکار کے تجربات و مشاہدات پر منحصر کرتی ہے کہ اس نے اپنے دائرے کو کتنا وسیع کیا۔

مختلف مکتبۂ فکر کے نقاد اپنے اپنے اصول کی روشنی میں تخلیقات کا تجزیہ پیش کرتے ہیں اور نتائج سامنے لاتے ہیں۔ ایک ساختیاتی و نفسیاتی نقاد اپنے اصول اور نظریئے کے حوالے سے ہی گفتگو کرے گا' ہم ساختیاتی نقاد سے نفسیاتی پہلو اجاگر کرنے کی بات نہیں کر سکتے۔ ہمارا مطالبہ ان سے یہ نہیں ہوتا کہ تخلیق کو اس زاویئے سے کیوں نہیں دیکھا گیا۔ ہاں یہ ضرور دیکھا جاتا ہے کہ وہ جس اصول اور نظریئے کے تحت تجزیہ پیش کر رہا ہے' اس کی وضاحت اس نظریئے کے مطابق ہوئی ہے یا نہیں۔ پھر کسی ادیب یا شاعر سے یہ مطالبہ کرنا کہ ان کی تخلیق میں یہ ہے' اور یہ نہیں ہے' کہاں تک درست ہوگا؟ ہونا یہ چاہئے کہ تخلیق میں جو موضوع یا خیال ہے اسے برتنے میں وہ کہاں تک کامیاب ہو سکا ہے۔

کیفی کی چند سیاسی نظموں کے حوالے سے کچھ نکات سامنے لانے کی سعی کروں گا' جس پر نقاد حضرات سیاسی' اشتراکی' احتجاجی اور پروپگنڈہ وغیرہ کا الزام لگاتے رہے ہیں۔ چند باتیں اختصار کے ساتھ سطور بالا کی روشنی میں عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ بات یہیں سے شروع کرتا ہوں کہ پروپگنڈہ کیا ہے؟ اور اس کی تعریف کیا ہے؟ پروپگنڈہ اگر اشتہار یا تبلیغ ہے کسی فلسفے یا نظریئے کا یا کسی خیال کا تو اس اعتبار سے ہر شعر ایک پروپگنڈہ قرار پائے گا' کیونکہ ہر شعر میں کسی نہ کسی خیال کی تبلیغ ہے' جس میں کچھ نہ کچھ مشتہر کرنے کی کوشش شامل ہوتی ہے اور اس خیال یا موضوع کا ڈانڈا بھی کسی نہ کسی فلسفہ اور نظریہ سے مل سکتا ہے۔ باوجود اس کے ہم ایسا کوئی الزام نہیں لگا سکتے' اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اظہار بیان سے یہ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ وہ اپنے خیال اور موضوع کے حوالے سے بات کر رہا ہے یا شعوری کوشش کے نتیجے میں اس کی تبلیغ کر رہا ہے یا پھر غیر شعوری طور پر وہ کسی نظریئے اور فلسفے کے قریب آ کر اس کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اگر کسی شعر سے کوئی فلسفہ یا نظریہ سامنے آ جائے تو یہ بالکل ضروری نہیں کہ شاعر اس فلسفہ یا نظریہ سے واقف ہی ہو۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو لاشعوری طور پر بھی انجام پا سکتا ہے۔ اگر یہ عمل لاشعوری طور پر انجام پاتا ہے تو اس میں افکار اور کردار کا بڑا دخل ہوتا ہے' کیونکہ وہ اپنے افکار اور کردار کی وجہ سے ہی کسی نظریہ اور فلسفہ کے قریب بار بار نظر آتا ہے' یا آ سکتا ہے اور یہ عمل بھی اسی وقت ممکن ہو سکے گا' جب وہ اپنے افکار اور کردار کے اعتبار سے سچا ہوگا۔ جھوٹ کا لبادہ

اوڑھ کر سچ کے گلیارے میں کوئی کب تک جا سکتا ہے؟

کیفی کا معاملہ بھی بالکل ایسا ہی ہے کہ وہ اپنے اشتراکی نظریئے کی تبلیغ نہیں کرتے' بلکہ یہ اشتراکیت تو ان کے افکار و کردار کا ایک حصہ ہے اور شاید ان کے دور کا مطالبہ بھی جو بار بار اپنے اصرار اور اظہار پر انہیں مجبور کرتا رہا ہے۔ اگر وہ اپنے عہد کی سچائیوں سے چشم پوشی کرتے یا اپنے افکار و کردار کے سچے نہ ہوتے تو اشتراکیت کے اس نکڑ میں نصف صدی سے بھی زائد عرصے تک کیوں خاک چھانتے؟

اس وضاحت کے بعد ہمیں یہ ضرور دیکھنا چاہئے کہ کیفی کے یہاں اشتراکیت کی نوعیت کیا ہے؟ یہ اشتراکیت ان کے افکار و کردار کا کوئی حصہ بن کر سامنے آیا ہے یا محض ایک نظریہ کی صورت میں۔ آپ ان کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ اشتراکیت کیفی کی نظر میں محض ایک نظریہ نہیں' بلکہ ان کی پوری زندگی ہی اشتراکیت سے عبارت ہے۔ مزاج و مذاق کے اعتبار سے بھی' قول و فعل' یعنی شخصی و شعری اعتبار سے بھی۔ انہوں نے اشتراکیت کو اوڑھا نہیں ہے' اشتراکیت نے کیفی کو اوڑھ لیا ہے' اور اب یہ ان کے فکری رویے کا جزو لاینفک بن گئی ہے' لہٰذا کیفی کا شعری تجزیہ بھی اسی حوالے سے ہونا چاہئے اور صحت مند تنقید کے لئے یہی طریقہ مناسب بھی ہوگا۔ اگر نظیر کو ان کے افکار' ادوار اور اطوار کے حوالے سے نہیں دیکھا جاتا تو آج انہیں اردو شاعری کا تابندہ ستارہ کون کہتا' اور کیوں کہتا؟

مندرجہ بالا نکات کی روشنی میں آپ کیفی کی شاعری کا مطالعہ کریں تو ان کی شاعری کا جواز بہت وضاحت کے ساتھ سامنے آئے گا اور ان کے شعری رویوں کا آپ مطلب بھی سمجھ سکیں گے۔ فی الوقت میں کیفی کی ان نظموں کے حوالے سے اپنی بات آگے بڑھاؤں گا جو سیاسی شاعری کے ضمن میں آتی ہیں۔

'نئے خاکے' اور 'کرن' یہ دونوں نظمیں ۱۹۴۴ میں تخلیق کی گئیں۔ دونوں کا موضوع ایک ہے جو گاندھی' جناح ملاقات سے متعلق ہے' مگر دونوں کے انداز بیان یا طرز اظہار میں جو نمایاں فرق ہے وہ کیفی کی شاعرانہ صلاحیت کو اجاگر کرتا ہے۔ ایک موضوع کو الگ الگ زاویئے سے مختلف انداز میں پیش کرنا' موضوع اور تقاضے کی اہمیت کو بھی ظاہر کر دیتا ہے۔

نظم 'نئے خاکے' اور 'کرن' میں ہندوستان کی سیاسی صورت حال کی بہترین عکاسی ہوئی ہے۔ یہ دور آزادی کی تحریک کا دورِ شباب تھا۔ ہندوستان کی غلامی آزادی کے دہانے پر کھڑی تھی۔ ایک جھٹکے سے غلامی کا طوق قدم پر آ رہتا۔ ہر طرف ایک ہنگامہ اور افراتفری کا ماحول تھا۔ فرنگیوں کی ناپاک اور

گھناؤنی کوششوں سے ہندوستان کی دو بڑی قومیں ایک دوسرے سے خائف تھیں' دونوں بے یقینی کے عالم میں ایک دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے تک رہی تھیں۔ فرنگیوں کے اس ناپاک منصوبے سے آزادی کی تحریک کو زبردست نقصان ہوسکتا تھا۔ ایسے ناگفتہ بہہ حالات میں گاندھی' جناح ملاقات ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ایک تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ دونوں افراد ہندوستان کی جنگ آزادی کے اہم رہبر تھے' لیکن دونوں کا مطمع نظر مختلف تھا۔ ایک ہندوستانی قوم یعنی دو قوموں کا نظریہ پیش کر رہے تھے اور دوسرے ایک قوم کی وحدت پر زور دے رہے تھے۔ یعنی جناح مسلم قوم کو ایک علیحدہ قوم تصور کر رہے تھے' جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان زبردست کشیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ ہندوستانی عوام اپنے دو اہم لیڈروں کی ملاقات اور اس سے حاصل نتائج کی منتظر تھی کہ ان کا اس طرح سر جوڑ کر بیٹھنا ہندوستانی عوام کی تقدیر میں اتحاد و اتفاق کی عبارت لکھے گا یا فسادات اور خون خرابے کی سرخ تحریریں درج کردے گا۔

کیفی کی یہ دونوں نظمیں اس عہد کی زندہ تاریخ ہیں' جو اپنے عہد کے سیاسی و سماجی منظر و پس منظر کو سامنے لاتی ہیں' جو نہ صرف ہندوستان کے حال اور مستقبل کا ایک نیا خاکہ پیش کرتی ہیں بلکہ ایک خوش آئند زندگی کی بشارت بھی دیتی ہیں۔ ان کی شاعری یا ان نظموں کے حوالے سے آپ ان کے افکار' ادوار اور کردار بھی مرتب کر سکتے ہیں اور وقت کی نزاکت کو سنجیدگی سے محسوس بھی کر سکتے ہیں۔ بظاہر یہ نظمیں سیاسی معلوم ہوتی ہیں' لیکن بہ باطن یہ نظمیں سیاسی کم سماجی زیادہ ہیں۔ ان کی بیشتر نظموں کا طرز عمل بھی یہی ہے۔ اس نظم میں ایک نئے ہندوستان اور ہندوستانی سماج کی تشکیل پر زور دیا گیا ہے۔ نظم کا مرکزی خیال آپسی نفاق اور فرقہ پرستی کے خلاف صدائے احتجاج کے طور پر سامنے آتا ہے' چونکہ یہ کشیدہ ماحول ہندوستان کے مفادات کے خلاف تھا' اور ہندو مسلم اتحاد سے ہی ہندوستان کے ماتھے سے غلامی کی سیاہی مٹ سکتی تھی۔ کیفی نے اس بات کو بڑی شدت سے محسوس کیا تھا' شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایک موضوع پر دو نظمیں تخلیق کیں' کہ کسی بھی طرح یہ بات ہندوستانی عوام کے دل میں اتر جائے اور اتحاد و اتفاق کی ایک فضا پھر سے قائم ہو جائے۔ اس اعتبار سے یہ نظمیں قومی یکجہتی کی بہترین مثال پیش کرتی ہیں۔ 'نئے خاکے' سے بند ملاحظہ فرمائیں:

نقوش حسرت مٹا کے اٹھنا' خوشی کا پرچم اڑا کے اٹھنا
ملا کے سر بیٹھنا مبارک ترانۂ فتح گا کے اٹھنا
یہ گفتگو گفتگو نہیں ہے بگڑنے بننے کا مرحلہ ہے
دھڑک رہا ہے فضا کا سینہ کہ زندگی کا معاملہ ہے

خزاں رہے یا بہار آئے تمہارے ہاتھوں میں فیصلہ ہے
نہ حسن بے تاب بجلیوں کو نہ مطمئن کاروانِ شبنم
کبھی شگوفوں کے گرم تیور کبھی گلوں کا مزاج برہم
شگوفہ و گل کے اس تصادم میں گلستاں بن گیا جہنم

یہ تیرگی کا ہجوم کب تک یہ یاس کا اژدہام کب تک
نفاق و غفلت کی آڑ لے کر جئے گا مردہ نظام کب تک
رہیں گے ہندی اسیر کب تک، رہے گا بھارت غلام کب تک
گلے کا طوق آ رہے قدم پر کچھ اس طرح تلملا کے اٹھنا

پوری نظم میں جو کیفیت اور روانی ہے وہ ایک جوش اور ولولے کے ساتھ انسانی جبلت کو جھنجھوڑتی ہے اور اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ جب تک ہمارے آپسی تعلقات خوشگوار نہیں ہوتے یا ہمارے درمیان اتحاد و اتفاق کی فضا قائم نہیں ہوتی۔ نئے ہندوستان کی تشکیل و تعمیر ممکن نہیں، جس اتحاد کی بنیاد پر 'آزاد' ہندوستان کی عمارت کھڑی تھی، وہ آپسی نفاق و منافرت سے متزلزل ہو چکی تھی، اور حالات کی نزاکت اس بات کی متقاضی تھی کہ وقت کے تقاضوں کو پورا کیا جاتا۔ نظم کا طرز اظہار اور موضوع ہی یہ ثابت کر دیتا ہے کہ کیفی نے وقت کے تقاضوں کو بڑی ذمہ داری کے ساتھ پورا کیا۔ اب کوئی صاحب نظر اسے ہنگامی موضوعات کی شاعری کہہ کر اس کی اہمیت سے انکار کرے تو یہ عمل منصفانہ نہیں ہوگا۔ پوری نظم میں کہیں بھی اشتراکیت یا ازم کا کوئی پروپگنڈہ نہیں، کوئی بے جا چیخ و پکار نہیں، کوئی بے معنی احتجاج نہیں، کہیں پر لہجہ ناصحانہ اور خطیبانہ نہیں۔ تشکیل و تعمیر کی فکرمندی، عاجزی اور دردمندی، آرزو اور بیداری ہر جگہ احساس کا دامن کھینچ کر ہمیں نہ صرف متوجہ کرتی ہے، بلکہ اس بات سے باخبر بھی کرتی ہے کہ یہ گفتگو محض دو سیاسی رہبروں کی سیاسی گفتگو نہیں ہے، بلکہ یہ ایک فیصلہ کن مرحلہ ہے، اور اسی مرحلے میں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے، لہٰذا کیفی مضطرب ہو کر اپنے احساس و شعور سے اس تیرگی ہجوم اور شگوفہ و گل کے تصادم کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ شگوفوں کے گرم تیور اور گلوں کے مزاج برہم سے ایک کیفیت پیدا کرتے ہوئے یہ سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ یہ مردہ نظام ہمارے نفاق و غفلت کی آڑ لے کر کب تک زندہ رہے گا؟ ہندی کب تک اسیر رہیں گے؟ بھارت کب تک غلام رہے گا؟ اس سوال کے بعد ایک پراعتماد لہجے میں یہ آرزو کرتے ہیں کہ اس نظم سے ایسا کچھ ہو جائے کہ تمام حسرتوں کے نقوش مٹ جائیں اور غلامی کا طوق گلے سے اتر جائے۔

پوری نظم اپنے اندر ایک عجیب و غریب کیفیت رکھتی ہے۔ عموماً ہنگامی موضوعات یا صورت حال پر تخلیق کی گئی نظموں میں لہجے کا سُر اونچا ہوتا ہے' لیکن ان نظموں میں فکری سُر بلند ہے۔ شائستہ انداز میں سلیقہ مندی سے کہی گئی بات ہنگامی موضوعات کو بھی سنجیدہ بنا دیتی ہے۔ یہ نظم اس کی بہترین مثال ہے۔

اسی موضوع پر دوسری نظم 'کرن' بھی مذکورہ کیفیات و خصوصیات کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ یہ نظم سیاسی ہوتے ہوئے بھی سماجی ہے۔ قومی یکجہتی اس کا بنیادی موضوع ہے۔ ترقی پسندوں نے فرقہ پرستی اور تنگ نظری کے خلاف اپنی آوازیں اس وقت بھی اٹھائی تھیں جب ہندوستان غلام تھا۔ مفاہمت پر لکھی گئی اس نظم کی معنویت کل سے زیادہ آج محسوس کی جاسکتی ہے' کیونکہ فرقہ پرستی اور تنگ نظری کا وہ پودا جو غلام ہندوستان میں لگا تھا وہ آزاد ہندوستان میں بہت تناور ہو چکا ہے۔ یہ تنگ نظری کل بھی ہندوستانی مفادات کے خلاف تھی آج بھی ہے۔ گاندھی' جناح ملاقات یا اس ملاقات سے متعلق یہ نظمیں اس بات کی ہی کوشش تھی کہ جس اتحاد نے ہندوستان کو آزاد کرایا' وہ اس آزاد ہندوستان کو داغ داغ اجالا کے بجائے ایک روشن مستقبل سے ہمکنار کرتا' جہاں کوئی منافرت' کوئی تنگ نظری اور کوئی فرقہ پرستی نہ ہوتی' لیکن ہماری غلطیوں نے اسے ہندوستان کا مقدر بنا دیا۔ کیفی اس کے اثرات و نتائج سے بے خبر نہیں تھے' شاید ان کی دور اندیش نگاہوں کے سامنے آج کے ہندوستان کا یہ نقشہ موجود تھا۔ ہندوستان کی سماجی و سیاسی فضا میں اس نظم کے ذریعے محبت اور شانتی کی جو تصویریں ابھاری گئی تھیں کیا وہ بے معنی تھیں' یا آج اس کی معنویت ختم ہو گئیں؟ کیفی کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا لہٰذا انہوں نے حساس لمحے کے اس تقاضے کو سمجھا اور سمجھایا۔ کیا ذمہ داری کے اس احساس کو کوئی لمحاتی اور احتجاجی شاعری کہہ کر خود کو دیدہ ور ثابت کر سکے گا؟ کیا کوئی آدمی اپنے جلتے سلگتے گھر میں بیٹھ کر دوستوں سے گپیں ہانکنا پسند کرے گا؟ کیفی نے اپنی شاعری میں گپیں نہیں ہانکیں اور نہ خیال کی آوارہ گردی پسند کی۔ شاعری گر جزو پیمبری ہے اور شاعر وقت کا نقیب ہے تو کیوں ہے؟ اس رموز سے کیفی واقف ہیں' شاید اسی لئے وہ پل بھر کے لئے بھی اپنے منصب اور شعری منشاء سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ ان کے حساس ذہن میں ایک پیغام ہے اور دردمند دل میں پوری انسانیت کی دردمندی جو انہیں اپنے ماحول سے بے خبر نہیں رہنے دیتی۔ نظم کے بند حوالے کے لئے پیش کر رہا ہوں:

اک دیا رات کی آغوش میں جلنے ہی لگا
تیرگی یاس کی کافور ہوئی جاتی ہے
ناخدا جوڑ کے سر بیٹھنے والے ہیں ادھر
اور ادھر سانس اکھڑنے لگی طوفانوں کی

موج کشتی کے تلے چور ہوئی جاتی ہے

کس نے یہ ساز اخوت پہ الاپا دیپک
اک دیا رات کی آغوش میں جلنے ہی لگا
تیرگی یاس کی کافور ہوئی جاتی ہے
سوز رفتار سے لو دینے لگی ہیں راہیں
وقت نے سینۂ احساس میں لے لی چٹکی
ڈال دیں گرم تقاضوں نے گلے میں بانہیں
آخری شرط بھی منظور ہوئی جاتی ہے

آپ خود مطالعہ کریں کہ ایک موضوع پر تخلیق کی گئی ان دونوں نظموں میں تکرار نہیں' اندازِ بیان مختلف' لفظیات مختلف' دونوں نظمیں اپنی جداگانہ اہمیت رکھتی ہیں' کوئی ہنگامہ یا پروپگنڈہ نہیں' نہایت سنجیدگی اور متانت سے بات کہی گئی ہے۔ نظم میں جو غنائیت اور تاثیریت ہے وہ قاری کو متوجہ کرتی ہے۔

اس کے علاوہ کیفی کی دوسری نظمیں بھی دیکھیں' عموماً جن کے رشتے سیاست سے جوڑ دیئے گئے' مگر نظم کی روح میں اتر کر سماج یا عوام کے ان مضبوط رشتوں کو نہیں دیکھا گیا جسے اپنا کر زندگی شرمندہ نہیں ہوتی بلکہ محترم ہو جاتی ہے۔ یہ وہ رشتے ہیں جو کچے دھاگوں سے نہیں' لہو کی تقدیس سے وجود پاتے ہیں۔ اس سلسلے میں مختلف نظموں کے محض چند بند پر اکتفا کرتا ہوں:

آج اس بار غلامی سے بہت چور ہیں سب
بھوک سے پیاس سے آزار سے رنجور ہیں سب
جان دے دینے پہ لڑ جانے پہ مجبور ہیں سب
پھونک دو صور کہ اب منتظر صور ہیں سب
ایک جھٹکے میں فقط طوق اتر جائے گا
ورنہ ٹھکرا کے تمہیں وقت گذر جائے گا
(سپردگی)

اک یہی سوز نہاں کل میرا سرمایہ ہے
دوستو میں کسے یہ سوز نہاں نذر کروں
کوئی قاتل سر مقتل نظر آتا ہی نہیں
کس کو دل نذر کروں اور کسے جاں نذر کروں

تم بھی ہو محبوب مرے تم بھی ہو دلدار مرے
آشنا مجھ سے مگر تم بھی نہیں، تم بھی نہیں
اپنی لاش آپ اٹھانا کوئی آسان نہیں
دست و بازو مرے ناکارہ ہوئے جاتے ہیں
جن سے ہر دور میں چمکی ہے تمہاری دہلیز
آج سجدے وہی آوارہ ہوئے جاتے ہیں
(آوارہ سجدے)

اٹھایا زندگی نے گنگنا کر وہ رباب اپنا
حقیقت سے گلے ملنے کو ہے رنگین خواب اپنا
یہ زنگ آلود مہریں جلد اے پیر مغاں لے جا
خم اپنے ہوں گے، ساغر اپنے ذوقِ انتخاب اپنا
جنہیں چاہیں گے ان کو میرِ میخانہ بنائیں گے
نئے ہندوستان میں ہم نئی جنت بسائیں گے
(نئی جنت)

ماضی کے تجربوں کو بھلایا نہ جائے گا
ہم سے فریب جان کے کھایا نہ جائے گا
ہو جائے گا اپنی گرد میں گم قافلہ جہاں
اس سمت اک قدم بھی اٹھایا نہ جائے گا
کس راستے پہ ہم کو لئے جا رہے ہیں آپ
(نئے مہربان)

ہاں مبارک ہو انہیں یہ کامیابی یہ خوشی
بخش دی جن منچلوں نے زندگی کو زندگی
ان شہیدوں کو خبر کر دے کوئی اس عید کی
جن کی گاتی گنگناتی نوجوانی لٹ گئی
دہر میں بجتا ہے ڈنکا آج ان کے نام کا
سو گئے جو موڑ کر رخ گردش ایام کا
(فتح برلن)

لال جھنڈا پھینک دو اے دیش بھگتو کیا کہا
یہ تو ہے سرمایہ داروں کی لٹیروں کی صدا
یہ صدا ان کی ہے جن کی نفع خوری کا جنون
چوستا ہے سینۂ مزدور سے دن رات خون
یہ صدا ان کی ہے جو برطانیہ کے ہیں غلام
یہ صدا ان کی ہے جو سنگھانیا کے ہیں غلام
یہ صدا ان کی ہے ٹاٹا نے ابھارا ہے جسے
یہ صدا ان کی ہے برلا نے سنوارا ہے جسے
(لال جھنڈا)

ایک دو بھی نہیں چھبیس دیئے
ایک اک کر کے جلائے میں نے
ایک دیا نام کا آزادی کے
اس نے جلتے ہوئے ہونٹوں سے کہا
چاہے جس ملک سے گیہوں مانگو
ہاتھ پھیلانے کی آزادی ہے

اک دیا نام کا یکجہتی کے
روشنی اس کی جہاں تک پہنچی
قوم کو لڑتے جھگڑتے دیکھا
ماں کے آنچل میں تھے جتنے پیوند
سب کو ایک ساتھ ادھڑتے دیکھا
(چراغاں)

لوٹ جب حد سے سوا ہوتی ہے
ظلم جب حد سے گذر جاتا ہے
میں اچانک کسی کونے میں نظر آتا ہوں
کسی سینے سے ابھر آتا ہوں
آج سے پہلے بھی تم نے مجھے دیکھا ہوگا

Library Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

کبھی مشرق کبھی مغرب میں
کبھی شہروں کبھی گاؤں میں
کبھی بستی کبھی جنگل میں
میری تاریخ ہی تاریخ ہے جغرافیہ کوئی نہیں
اور تاریخ ایسی جو پڑھائی تو نہیں جا سکتی
لوگ چھپ کر پڑھا کرتے ہیں

(بنگلہ دیش)

ان نظموں کے علاوہ بھی کیفی کی کئی ایسی نظمیں ہیں مثلاً تلاش' کب تک' آخری مرحلہ' مژدہ' یلغار' قومی حکمراں' قومی اخبار' تاریکی' دوسرا طوفان' سوویت یونین اور ہندوستان' تربیت' سلام' ہم آگے ہی بڑھتے جا رہے ہیں' فرغانہ' گربھوتی' انتشار' لینن' دھماکہ اور تحریک آزادی وغیرہ جن کا مزاج یہی ہے کہ یہ سیاسی ہوتے ہوئے بھی سیاسی نہیں ہیں۔

مندرجہ بالا نظموں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اس کا رشتہ سیاست سے نہیں بلکہ سماج اور اس کے عوامل سے ہے' زندگی اور اس کے مسائل سے ہے۔ آپ ان نظموں میں ماضی' حال اور مستقبل کا چہرہ دیکھ سکتے ہیں' جانبازوں اور شہیدوں کی قربانیوں کے ساتھ ساتھ کیفی کی وطن پرستی' ان کی دردمندی اور سیاسی شعور بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ان کی شاعری اپنی اثر پذیری کے ساتھ افکار کے سانچے میں ڈھلتی چلی گئی۔ نظم کا شعری حسن ہر مصرعے میں برقرار ہے۔ نظم کی روانی اور تسلسل سے جو غنائیت چھن کر آتی ہے وہ ایک سماں پیدا کر کے قاری کو اپنے طلسم سے مسحور کر دیتی ہے۔ صوتی اعتبار سے نظموں میں 'ل' 'م' اور 'ن' جیسے حروف جو غنائیت کے لئے مشہور ہیں کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ تراکیب بھی نہایت سلیقے سے برتی گئی ہیں جیسے نقوش حسرت' ترانۂ فتح' کاروان شبنم' شگوفہ و گل' نفاق و غفلت' سازِ اخوت' سوزِ رفتار' سینہ احساس' گردش ایام' درد غلامی' منتظر صور' سوز نہاں اور ذوق انتخاب وغیرہ تراکیب کے دروبست یا الفاظ کی بندش سے بھی غنائیت اور روانی پیدا ہوگئی ہے۔ نظموں میں جو تلمیحات استعمال ہوئی ہیں' وہ ہمیں موضوع اور عہد کے قریب کر دیتی ہیں' جس سے نظموں کی معنوی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ کوئی الفاظ یا اشارہ ایسا استعمال نہیں ہوا ہے' جو مبہم ہو۔ بہت پیچیدہ استعاروں' تشبیہوں اور کنایوں سے پرہیز کیا گیا ہے۔ نظموں میں رجز اور محاکاتی نظام بھی خوبصورتی سے استعمال ہوا ہے' مختصر یہ ہے کہ ان کی شاعری فنی رچاؤ یا التزام سے محروم نظر نہیں آتی۔ لیکن میں اس بات کا دعویٰ بھی نہیں کرتا کہ ان کی شاعری میں فنی کمزوریاں نہیں ہیں یا ہر شعر بے مثل ہے' آپ کو کمزور اشعار بھی مل جائیں گے' لیکن ایسے

نے آپ کے مقالے کی کافی تعریف سنی ہے۔ میں وہ مقالہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ بہار کے مشاعرے میں اگر آنا ہوا تو آپ سے ملنے آپ کے گھر رانچی ضرور آؤں گا۔ اسی درمیان جاوید اختر کا روزنامہ ہندی اخبار 'پربھات خبر' رانچی کے پروگرام میں آنا ہوا۔ شاید وہ پروگرام فرقہ پرستی کے خلاف تھا' جس میں ایک شعری نشست کا انعقاد بھی کیا گیا تھا۔ اس شعری نشست میں' میں بھی بحیثیت شاعر مدعو تھا۔ نشست ختم ہونے کے بعد میں نے جاوید اختر سے ملاقات کی اور بتایا کہ میں نے کیفی صاحب پر پی ایچ ڈی کیا ہے۔ انہوں نے اچھا' بہت خوب کہہ کر' اس سلسلے میں مزید کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی کچھ پوچھا۔ میں نے بھی آگے کچھ نہیں کہا اور وہاں سے اٹھ کر چلا آیا' جبکہ ہمارے تمام ساتھی (ڈورنڈہ) کے ایک بڑے ہوٹل میں ان سے رات بھر باتیں کرتے رہے۔

۱۹۹۳ سے ۱۹۹۹ کے درمیان مجھ پر قیامتیں ٹوٹیں' میں بری طرح سے ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔ ان چھ سالوں کے درمیان میرا سب کچھ لٹ گیا تھا۔ کیونکہ والد اور پھر والدہ کا سایہ ہی سر سے اٹھ چکا تھا' میں نے ان چھ سالوں کو اس طرح گزارا ہے' جیسے کسی بیمار کی رات گذرتی ہے۔ میں ادب کی دنیا سے بالکل کٹ چکا تھا' ایک ادبی رسالہ 'حصار' کے نام سے نکالا کرتا تھا' وہ بھی بند ہو گیا' جس کی ضرورت آج بھی پوری شدت سے محسوس کرتا ہوں۔

ایک جون، ۱۹۹۹ کو میری نوکری بہار و دھان پریشد کے اردو شعبہ میں ہوگئی۔ اس طرح میں خود کو حصار ذات سے کچھ باہر نکال لایا۔ دل کی بے چینیاں کچھ کم ہوئیں اور غم کچھ ہلکا ہوا تو میں نے کیفی صاحب کو خط لکھا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں' اس وقت وہ اپنے گاؤں مجواں میں تھے۔ جواب آیا کہ آپ چلے آئیں' میں ۱۹ اکتوبر تک گاؤں میں ہوں اور بے صبری سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ آنے کی تاریخ بتاتے تو گاڑی اسٹیشن بھیج دیتا۔ انہوں نے آنے کا پورا ڈائرکشن دے دیا تھا۔ میں ۱۶ اکتوبر، ۱۹۹۹ کو درگا پوجا کی چھٹی میں پٹنہ سے چلا اور شام پانچ بجے شاہ گنج اسٹیشن ان کی ہدایت کے مطابق اتر کر اسٹیشن سے باہر آیا۔ وہاں سے ان کو فون کر کے آنے کی خبر کر دی۔ باہر غالباً ہر ٹیکسی والا کیفی صاحب کو جانتا تھا اور گھر تک پہنچانے کو بھی تیار تھے۔ راستے میں میں نے ڈرائیور سے پوچھا کہ آپ کیفی صاحب کو کیسے جانتے ہیں؟ تو اس نے کہا کہ اس علاقے میں انہیں کون نہیں جانتا؟ انہوں نے اعظم گڑھ یا اپنے گاؤں مجواں کے لئے بہت کام کیا ہے۔ اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں اور پھر ہم لوگ اس جگہ پہنچ گئے' جہاں ایک سنگی دیوار پر ہندی اور اردو میں 'کیفی اعظمی روڈ' لکھا تھا۔

ڈرائیور نے بتایا کہ جس روڈ پر ہم لوگ چل رہے ہیں' یہ راستہ انہیں کا بنوایا ہوا ہے۔ اس راستے کی وجہ سے کئی گاؤں آباد ہو گئے۔ یہ سڑک تقریباً دس کیلو میٹر لمبی ہے۔ چلتے ہوئے سامنے دو آدمی

اشعار کی تعداد بہت کم ہے۔ جو کمزوریاں ہیں ان سے کیفی کو انکار بھی نہیں ہے' کیونکہ کمزوریاں تو ہر جگہ موجود ہیں۔

اس طویل گفتگو کے بعد آپ کی توجہ اس جانب مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کیفی کی نظموں کو ادوار' افکار' تقاضے' لفظیات یا طرز بیان کے حوالے سے دیکھیں یا کسی اور حوالے سے کیفی ایک سچے فنکار کی طرح اپنے عہد کے چیلنجز سے نبرد آزما نظر آئیں گے۔ یہ کہیں بھی محسوس نہیں ہوتا ہے کہ ان کی شاعری صرف اس سیاست کے لئے وجود میں آئی ہے جو عہدہ اور کرسی کے پائے سے بندھی ہوتی ہے' اگر ان کی شاعری کا تعلق کہیں سیاست سے ہے بھی تو ان کی سیاسی ایمانداری کا جواب نہیں' جس پر شک کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ وجہ یہ ہے کہ پوری شاعری میں کوئی مصالحت ذاتی مفاد کے لئے نظر نہیں آتی' ہر اس جگہ پر ان کا احتجاجی لب ولہجہ ہی سامنے آتا ہے جہاں سیاسی بدعنوانی یا ریاکاری ہوئی ہے۔ ان کی پوری شاعری میں ظہور پذیر حادثات و واقعات کے ساتھ عہد کی سچائیاں بھی جھانکتی ہیں' لہٰذا تجزیئے کا جو بھی پیمانہ آپ تجویز کریں خواہ ان کی شاعری کو ان کے عہد اور نظریئے کے حوالے سے دیکھیں یا نظم نگاری کی خصوصیات و شعری تنقید کی روشنی میں' تو یہ ضرور محسوس ہوگا کہ ان کی شاعری اردو ادب کے بیش بہا خزانے میں نہ صرف اضافے کی بلکہ عوام الناس کے لئے ایک عظیم سرمائے کی حیثیت رکھتی ہے۔ درج ذیل نکات پر سیر حاصل گفتگو ہو چکی ہے لہٰذا نہایت اختصار میں چند باتیں عرض کر دوں کہ مقدمہ شعر و شاعری میں حالی نے شاعری کی جن خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے مثلاً سادگی' جوش اور اصلیت یا دیگر خصوصیات' یا پھر شبلی نے مقالات شبلی جلد دوم میں کلام کی غرض و غایت اور نیچرل شاعری سے متعلق جو تنقیدیں پیش کیں' یا جدید نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کا مقالہ ''ادب اور اس کی غائیت'' ماہنامہ' نئی نسلیں' ۱۹۵۵ میں جن نکات کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ آپ مذکورہ تمام حوالوں کی روشنی میں ان کی نظموں کا جائزہ لیں' یا ان میں سے جس کسوٹی پر چاہیں رکھ کر دیکھیں آپ کو وہ شعری خصوصیات یقیناً مل جائیں گی' جن پر کئی مکتبہ فکر کے نقاد متفق نظر آتے ہیں۔ تب کیفی کی شاعری' ان کی انفرادیت اور اہمیت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا اور پھر تحیرات کی وہ دنیا بھی سامنے آئے گی جہاں حسن تخیل' مناظر فطرت کی عکاسی' واقعہ نگاری' محاکات' جذبات نگاری' حقیقت پسندی' موضوعات کا تنوع' سماجی رجحان' تجربات کا اظہار' مقصدیت' ذات اور کائنات' صحت مند روایت کی پاسداری' انسان دوستی' ماضی کی یادگار' حال کا چہرہ اور مستقبل کا اشاریہ جیسی تمام شعری خصوصیات سے آپ متعارف ہوں گے' تو یہ سوچنے پر ضرور مجبور ہوں گے کہ یقیناً کیفی بے توجہی کے شکار رہے۔

■■

■■■ فلمی نغمے

گیت اور سنگیت کا تعلق انسان کے جذبات و احساسات سے بڑا گہرا ہے۔ انسان نے جب شروع میں اپنی آنکھیں ایک بے معنی آواز کی دنیا میں کھولی ہوں گی' تو اس وقت پہاڑ' جھیل' جھرنے' دریا' چرند' پرند وغیرہ مختلف قسم کی چیزیں اپنے اردگرد پائی ہوں گی' ظاہر ہے ان چیزوں کی اپنی ایک آواز تھی جس کا کوئی واضح مفہوم نہ تھا۔ ان آوازوں سے اس پرسکون ماحول میں یقیناً ایک ارتعاش پیدا ہوا ہوگا۔ انسان نے انہیں آوازوں کی مدد سے بولنا سیکھا اور اپنی آوازوں کو ایک معنی دینے کی کوششیں شروع کیں۔ ان آوازوں سے اپنی آوازیں ملا کر لفظوں کی تشکیل شروع ہوئی ہوگی' لفظوں کے نام وضع ہوئے ہوں گے اور اس طرح بے معنی آوازوں کو ایک مفہوم ملتا چلا گیا۔

ماہر لسانیات کے نزدیک اس کی الگ الگ 'تھیوریاں' ہیں مثلاً کسی نے Bow-woe theory تو کسی نے Sing-Song theory اور کسی نے Ding-Dong theory کے علاوہ دیگر تھیوریز کو اپنا ذریعہ بنایا اور ان سے لفظوں کا رشتہ استوار کرتے ہوئے زبانوں کی تشکیل کی طرف اپنا قدم بڑھایا۔ ہر ماہر لسانیات نے اپنی تھیوری پر زور دیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ زبان کی تشکیل آوازوں کی بنیاد پر قائم ہے۔ ایک مدت تک آوازوں کو سننے' ان کی مماثلت اور عدم مماثلت کی منزل سے گذرنے کے بعد ہی آوازوں کی مناسبت اور مطابقت سے الفاظ وضع ہوتے رہے اور انہیں لفظوں اور آوازوں سے لئے اور نغمے دریافت کئے گئے۔

امیر خسرو نے ہندوستانی موسیقی میں اپنے جوہر دکھائے اور کمال حاصل کیا۔ گیت اور سنگیت کے کئی آلے انہوں نے ایجاد کئے تھے۔ نئے گیت اور لئے بھی اختراع کئے۔ امیر خسرو کے بعد مسلمانوں میں موسیقی سے دلچسپی عام ہوگئی۔ ہندوستانی معاشرے میں گیت کو ایک غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ بدھ مذہب کے ماننے والوں نے اپنے مذہب کی ترویج و اشاعت کے لئے گیتوں کا ہی سہارا لیا۔ حضرت نظام الدینؒ کی محفلوں میں زبان ہندوی میں ہی نعت اور منقبت گائی جاتی تھی۔ جو صرف اسلامی نقطہ نظر سے ہی نہیں بلکہ شعری' تہذیبی اور تاریخی اعتبار سے بھی بہت اہم ہے۔ ان محفلوں

میں جو زبان جو طرز کلام پسندیدہ رہا وہی اردو زبان اور شعر و شاعری کی صورت میں رائج اور مقبول بھی ہوا۔

مذکورہ باتوں کی وضاحت اور تفصیل کا مقصد صرف یہ ہے کہ گیت اور سنگیت میں ہندوستانی رنگ شروع سے حاوی رہا ہے۔ جو اس کی روح کی گہرائی میں اتر کر رچ بس گیا ہے۔ ہندوستانی رنگ میں گیت پر نئے نئے تجربے ہوئے اور یہ گیت خواص سے نکل کر عوام تک پہنچے اور مقبول ہوئے' نیز ان کا دائرہ کار اسی طرح بڑھتا رہا اور یہ اپنا رنگ روپ نکھارتا رہا۔ گیت کے اندر وہ تمام چیزیں سمٹ آئیں' جن کے تعلق انسان کے احساسات و جذبات سے تھے' اور گیت کے اندر یہ صلاحیت بھی موجود تھی کہ وہ ہر جذبے کی ترجمانی کر سکے۔ خواہ اس کا تعلق غم سے ہو یا مسرت سے' ذات سے ہو یا کائنات سے۔ آدمی گیت کو اپنے احساسات کی ترجمانی کا بہترین وسیلہ بناتا چلا گیا۔ گیت کی کامیابی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ یہ براہ راست انسانی حسیات کو متاثر کرنے کی زبردست صلاحیت رکھتا ہے۔ لہٰذا گیت میں وہ تمام باتیں اور کیفیتیں آپ محسوس کر سکتے ہیں' جو انسان کے شعور اور لاشعور میں موجود ہیں۔

موجودہ زمانے میں گیت کی اہمیت مسلم ہے' بلکہ جیسے جیسے زمانہ ترقی کر رہا ہے' گیت کا زور بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ جس طرح اب انسانی مسائل بڑھ رہے ہیں' اس کا دامن بھی کشادہ ہوتا جا رہا ہے۔ مختصر یہ کہ دنیا کے تمام موضوعات کا احاطہ اب گیت میں ممکن نظر آنے لگا ہے۔

محفلوں میں گائی جانے والی قوالیوں' شادی بیاہ کے موقع پر گائے جانے والے گیتوں اور لوک گیتوں کی ہی طرح فلمی گیتوں کا بھی اپنا ایک خاص مقام ہے۔ کیفی اعظمی کے فلمی نغموں میں ایسے کئی پہلو روشن ہیں' جن کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ انسانی شعور اور لاشعور سے ہے۔ بمبئی فلم انڈسٹری میں بے شمار گیت کار نغمے لکھتے رہے' بیشتر گیت کاروں نے خود کو اس دنیا میں گم کر دیا' جن کی تلاش بھی آج مشکل ہے۔ جنہوں نے فن کو یا اپنی شناخت کو وقتی چکا چوند میں قربان کر دیا' یا صرف ڈائرکٹر کی ہدایت اور فلم کے تقاضے کو پورا کرنے کے لئے شعری تقاضوں کا خیال نہیں رکھا۔ ان کی شناخت معدوم ہوتی چلی گئی' نہ ان کے گیت زندہ رہے اور نہ وہ خود گیتوں کی وجہ سے زندہ رہ سکے اور بہت کم عرصے میں ہی ایسے گیت کار فراموش کر دیئے گئے۔ لیکن جن لوگوں نے فلمی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے شاعری کے فن کو ملحوظ خاطر رکھا اور فنی لوازمات کو پورا کرتے ہوئے نغمے تخلیق کئے وہ فلمی دنیا کے علاوہ ادبی دنیا میں بھی کامیاب رہے۔ ایسے ہی کامیاب گیت کار کی حیثیت سے کیفی اعظمی بھی جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ کیفی اعظمی نے محض پیسوں کی خاطر یا سستی شہرت کے لئے اپنے فن سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ فلمی دنیا میں ان کا نام ایک ممتاز نغمہ نگار کی حیثیت سے کافی مقبول ہے۔

چوتھی دہائی سے چھٹی دہائی کے درمیان کتنے ترقی پسند اور جدید شعراء بمبئی جا کر فلموں سے جڑ گئے اور فلمی اعتبار سے کامیاب بھی ہوئے جن میں مجروح، ساحر، جاں نثار اختر، شکیل بدایونی، حسرت جے پوری، گلزار اور کیفی اعظمی کے نام اہم ہیں۔

کیفی اعظمی بہت غریبی اور مفلسی کی زندگی جھیل کر بمبئی پہنچے تھے، پہلا بچہ غربت کی وجہ سے خاطر خواہ علاج کی کمی کے باعث مر چکا تھا۔ دوسری اولاد شبانہ اعظمی کی صحیح تعلیم و تربیت کی انہیں بہت فکر تھی وہ چاہتے تھے کہ شبانہ کا داخلہ اچھے اسکول میں ہو، اس کی تعلیم غربت کی وجہ سے متاثر نہ ہو، لہٰذا انہوں نے فلموں میں گانے لکھنے شروع کر دیئے۔ شاید لطیف کیفی کے حالات سے باخبر تھے لہٰذا انہوں نے فلم 'بزدل' کے لئے کیفی کو سائن کیا اور دو گانے کیفی کو دیئے۔ 'بزدل' سے ہی کیفی کا فلمی کیریر شروع ہوتا ہے۔ اس فلم کے لئے انہوں نے جو گانے لکھے تھے ان کے بول کچھ یوں ہیں:

- روتے روتے گذر گئی رات رے
- کاہے اب رے بلم

ان گانوں کے لئے کیفی کو ایک ہزار روپے ملے تھے۔ اسی طرح دھیرے دھیرے کیفی کو گانے ملنے لگے۔ گرودت کی فلم 'کاغذ کے پھول'، موہن سہگل کی فلم 'اپنا ہاتھ جگن ناتھ'، ایک کے بعد ایک، وغیرہ کے گانے لکھتے رہے اور مقبول ہوتے رہے۔ 'کاغذ کے پھول' اور 'شعلہ و شبنم' کے گانے کافی مقبول ہوئے تھے۔ خصوصاً 'شعلہ و شبنم' کا یہ گانا۔

جانیں کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں یہ آنکھیں مجھ میں
راکھ کے ڈھیر میں شعلہ ہے نہ چنگاری ہے

پھر ان کی ملاقات چیتن آنند سے ہوئی۔ فلم 'حقیقت' میں گانے لکھنے کا معاہدہ کیا۔ 'حقیقت' کے گانے بہت مقبول ہوئے اور کیفی مستقل طور پر چیتن آنند کی فلموں میں گیت لکھنے لگے۔

فلمی دنیا میں کیفی کے دو بڑے اہم کارنامے ہیں، ایک تو چیتن آنند کی فلم 'ہیر رانجھا' جو کہ پوری منظوم فلم ہے، اور یہ پہلی منظوم فلم تھی جس میں کیفی نے منظوم ڈائیلاگ لکھے اور پھر اس کے گانے لکھ کر انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ان کے اندر بے پناہ شعری صلاحیتیں موجود ہیں۔ گو کہ وہ فلم ناکام رہی، اس ناکامی کی وجہ کچھ اور تھی۔ اس فلم کے منظوم ڈائیلاگ اور گانے آج بھی لوگوں کے حافظے میں محفوظ ہیں۔

کیفی اعظمی کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ 'گرم ہوا' جسے سیتھو نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ اس کا اسکرین پلے اور ڈائیلاگ بھی انہوں نے ہی لکھا تھا، اور اس فلم کو تین فلم فیئر ایوارڈ ایک ساتھ ملے اور کہانی کے لئے نیشنل ایوارڈ بھی ملا۔

کیفی نے فلمی صنعت کے اندر کچھ ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں' جو ان کے ہم عصروں کو میسر نہیں۔ انہوں نے فلمی دنیا میں بھی اپنی حیثیت اپنی صلاحیت کی بنیاد پر منوائی۔ چھوٹے بجٹ کی فلموں اور تجرباتی فلموں کی تاریخ جب بھی لکھی جائے گی' کیفی کے بغیر وہ تاریخ ادھوری ہوگی۔ اس کے علاوہ بھی کیفی کا ایک اور بڑا کارنامہ سامنے آتا' مگر بدقسمتی سے وہ فلم نہ بن سکی۔ غالب کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر سیتھو نے ایک فلم بنائی تھی' جس کی حیثیت ایک دستاویزی فلم کی تھی۔ یہ فلم بھی کیفی نے ہی لکھی تھی اور اس میں آواز بھی کیفی ہی کی تھی۔ لیکن غالب سے متعلق وہ فلم نہ بن سکی۔ جس کے پروڈیوسر ساون کمار ٹاک ڈائرکٹر سکھ دیو تھے اور ہیرو امیتابھ بچن تھے۔ جس کی رسم اجراء ڈاکٹر ذاکر حسین کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ یہ فلم اگر مکمل ہو جاتی تو یقیناً کیفی کا ایک اور بڑا کارنامہ سامنے آتا یہ فلم غالب سے متعلق دوسری فلموں سے زیادہ کامیاب اور مختلف ہوتی۔

ترقی پسند شعراء کی رومانویت اور سماجی رجحان نے یقیناً فلمی دنیا کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا ہے۔ ان لوگوں نے فلموں میں گیت لکھ کر یہ ثابت کیا کہ ان کے یہاں صرف کائنات کے خارجی احساسات اور تجربات نہیں' بلکہ ذات اور داخلیت کا وہ لطیف احساس بھی ہے' جن کے طلسم سے نکلنا آسان نہیں ہے۔ کئی دہائیوں کے بعد بھی ہم ان آوازوں کے اسیر معلوم ہوتے ہیں اور آج بھی ان آوازوں میں اتنی قوت باقی ہے کہ وہ ہماری داخلی کیفیات کو مس کر جاتی ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی جدت طرازی سے آرٹ فلموں کے علاوہ کمرشیل فلموں میں بھی ایسی شاعری گھول دی کہ گیت اور سنگیت کا رخ ہی بدل گیا۔ ایک نئی کیفیت اور لذت سے فلموں کو روشناس کرایا۔ زبان کی چاشنی' سلاست اور روانی سے فلموں میں ایک سحر انگیز کیفیت پیدا کی اور اسی کے ذریعے اردو شاعری کے نئے عاشق پیدا کئے اور اس طرح اردو شاعری کے افہام و تفہیم کا ایک نیا در وا ہوا۔ اگر ترقی پسندوں کے یہاں صرف خطابت' احتجاج اور نعرہ بازی ہی ہوتی تو ہرگز ہرگز یہ کیفیت پیدا نہ ہوتی۔ یہ سب کچھ ان کی شاعری میں اگر تھی بھی تو اس کا ایک واضح مقصد بھی تھا۔ اگر وہ شاعری مقصد اور وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ہے تو ہمیں مطعون کرنے کے بجائے کھلے ذہن سے اس کا استقبال کرنا چاہئے کیونکہ اس کا تعلق زندگی اور زندگی کے مسائل سے بہت مربوط نظر آتا ہے۔

فلمی شاعری کی سب سے بڑی کسوٹی یہ ہے کہ گانا' فلم کے منظر میں ڈھل کر اس طرح پیوست ہو جائے کہ منظر کا ہر وہ پہلو روشن ہو سکے' جسے ہدایت کار اپنے ڈائرکشن میں دکھانے سے قاصر ہو۔ نغموں میں وہ تمام کیفیات اور جذبات ابھر آئے جس کا منظر متقاضی ہے۔ فلمی نغموں کا کمال بھی یہی ہے کہ وہ منظر کا تقاضا اور ضرورت بن جائیں۔ فلمی شعراء کی مجبوری یہ ہوتی ہے کہ انہیں ڈائرکٹر کی مرضی سے کہانی

کے مطابق گیت لکھتے ہوتے ہیں' اور انہیں تقاضوں کو پورا کرنے میں بیشتر شعراء فنی تقاضوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں' جن سے ان کی شاعرانہ حیثیت مجروح ہو جاتی ہے۔ یہی وہ گھڑی ہے جب تمام تقاضے ایک چنوتی بن کر سامنے آتے ہیں۔ اب شاعر کتنا با کمال ہے یا فن پر کتنا دسترس رکھتا ہے یا یوں کہیں کہ فنی لوازمات کو بروئے کار لانے اور فلمی تقاضوں کو پورا کرنے کی کتنی صلاحیت اس کے اندر موجود ہے' اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے' جب اسے نبھانے کی وہ سعی کرتا ہے اور اپنی انفرادیت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔

کیفی اعظمی نے فلمی و ادبی دونوں تقاضوں کو بہ حسن وخوبی انجام دیا ہے۔ وہ فلموں میں اپنی ایک الگ انفرادیت قائم کرتے ہوئے' گیت کے اندر وہ تمام پہلو روشن کر دیتے ہیں' جسے ابھارنے یا فلمانے میں کہانی کار یا ہدایت کار ناکام نظر آتے ہیں۔ کیفی کے نزدیک فلمی نغموں کا جو تصور یا جواز ہے' وہ یہی کہ گیت کے حوالے سے وہ تمام نادیدہ پہلو سامنے آئے جو کیمرے میں بند نہیں ہو سکتے۔ فلموں میں گیت لکھنا آسان نہیں یہ کام جوکھم کا ہے۔ اس کے ایک ایک پوائنٹ پر دھیان دینا ضروری ہوتا ہے' چاہے معاملہ ساز کا ہو یا آواز کا' منظر کا ہو یا پس منظر کا' سب کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ گیت وہ کیفیت ہی پیدا نہیں کر پائے گا۔ جس کی فلموں میں بڑی اہمیت اور ضرورت ہوتی ہے۔

فلموں میں نغموں کی روایت بڑی پرانی ہے۔ آج سے ۳۰ سال قبل کی فلموں میں گیتوں کی تعداد بارہ پندرہ ہوا کرتی تھی۔ فلموں میں بے شمار گیتوں کا جواز بھی شاید یہی تھا کہ ہر منظر کی ترجمانی بھی گیت سے ہی ہو اور یہ پرانی فلموں میں اس لئے بھی ممکن تھا کہ فلمیں لمبی ہوا کرتی تھیں' مگر حالات اور وقت کے تقاضوں کے پیش نظر فلمیں چھوٹی ہوتی گئیں اور بائیس' چوبیس ریل کی فلمیں بارہ اور چودہ ریل تک سمٹ گئیں۔ اسی مناسبت سے گیت بھی کم ہوتے گئے اب اس کی تعداد بھی دو سے چھ ہو کر رہ گئی ہے۔ فلموں میں گیتوں کی یہ تعداد ان معنوں میں اچھا ہے کہ آدمی اباہٹ کی کیفیت سے محفوظ ہو گیا۔ پہلے گیتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس لئے اس پر توجہ کم ہوتی تھی۔ مگر بعد کے فلمی گیتوں میں خاص توجہ اس لئے بھی دی جاتی ہے کہ اس کے اخراجات کافی بڑھ گئے ہیں۔ لہٰذا کم تعداد میں ہی وہ مناظر کی احاطہ بندی کر دینا چاہتے ہیں اور اس بات کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے کہ گیت مناظر کی مکمل ترجمانی کر سکے۔ شاید یہی چیز گیت اور سنگیت کی دنیا میں ایک نئی تلاش کی طرف ہمیں لے جاتی ہے۔ یہی تلاش اور جستجو گیتوں کو نئے تقاضوں سے جوڑتی بھی ہے اور اس کے دامن کو کشادہ بھی کرتی ہے۔

کیفی ان تمام باتوں سے بخوبی واقف تھے' وہ فلمی تقاضوں کو پورا کرتے وقت عوام کی دلچسپی کا خاص خیال رکھتے تھے اور مطلوبہ فکر کو بڑی خوبصورتی سے نغموں میں ڈھال کر ان کے لطیف احساسات

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

اور جذبات کو بیدار کر دیتے تھے۔ فلمی گیتوں نے جہاں لوگوں کے دلوں کو بہلایا ہے یا درد کا درماں بنے ہیں۔ وہیں انہوں نے انقلاب و اضطراب کی کیفیت بھی پیدا کی ہے۔ ان نغموں نے کہیں سماج اور معاشرے پر ہنسنے کے لئے مجبور کیا ہے' تو کہیں اسی سماج اور معاشرے کی حالت پر خون کے آنسو بھی بہائے ہیں۔ جہاں محبوب کی فرقت میں بے چین اور مضطرب کیا' وہیں محبوب کے وصل میں ایک لذت بھی عطا کی۔ غرضکہ فلمی گیتوں کے ذریعہ شعبۂ حیات کے ہر اس نکتہ کو سامنے لایا گیا جس کا گہرا تعلق انسان اور انسان کی زندگی سے ہے۔ شاید اسی لئے دوسری اصناف سخن کے مقابلے گیت ہمیں زیادہ متاثر اس لئے کرتا ہے کہ اس کا براہ راست تعلق عوام الناس سے ہے' لہٰذا یہ میڈیا کے ذریعے جلد عام ہو کر مقبول ہو جاتے ہیں۔

فلمی دنیا میں کیفی کی انفرادیت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے صرف فلمی اور فنی تقاضوں کو پورا نہیں کیا' بلکہ پوری ذمہ داری کے ساتھ فلم کی کہانی یا منظر میں خود کو شامل کیا اور خود کہانی کا ایک کردار بن کر اس کے محسوسات کو اپنے اندر جذب کیا' تب گیت لکھے۔ ان کے گیتوں کے جائزے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کہانی کی کیفیت میں اپنے احساس کو ڈھال دیا ہے۔ اسی لئے نغمے کبھی کہانی یا منظر کے اعتبار سے انمل یا بے میل معلوم نہیں ہوتے' بلکہ وہ کہانی کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔ کیفی نے جہاں کہیں حکومت پر طنز کیا ہے یا بڑھتی ہوئی مہنگائی کو موضوع بنایا ہے' اس کو اس طرح کہانی میں گھول دیا کہ وہ نغمہ شاہکار بن کر ذہن میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ فلم 'ایک کے بعد ایک' کا یہ گیت دیکھیں:

نہ تیل اور نہ پانی' نہ قابو ہوا پر
دیئے کیوں جلائے چلا جا رہا ہے
اجالوں کو تیرے سیاہی نے گھیرا
نگل جائے گا روشنی کو اندھیرا
چراغوں کی لو پر دھواں چھا رہا ہے
دیئے کیوں جلائے چلا جا رہا ہے

کیفی اعظمی کا ایک مجموعہ ''میری آواز سنو'' فلمی گیتوں پر مشتمل ہے۔ اگر اس مجموعے کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ کیفی نے فلموں میں صرف گیت نہیں لکھے' بلکہ فلمی گیتوں کو ایک نئی سمت عطا کی اور اپنی شاعری کے ذریعہ ایک نئی توانائی بخشی ہے۔ ان کے نزدیک فلمی نغمے محض پیڑ کے اردگرد ناچنے گانے اور دھوم مچانے کے لئے نہیں ہوتے' بلکہ ان کا مقصد ہے کہ عوام کے اندر ایک نئی سوچ بیدار ہو جائے اور زندگی کا ایک نیا زاویہ سامنے آئے۔ خیالات و تصورات کے دروا ہوں جو ہر باشعور انسان

کے لئے ضروری ہے تا کہ وہ زندگی کو ہر رنگ میں قریب سے پہچان سکے۔

یوں تو کیفی نے فلموں میں بے شمار گانے لکھے' ہر گانے کا ذکر ہمارا مقصد نہیں' طوالت کو ملحوظ رکھتے ہوئے چند گانوں پر ہی اکتفا کرنا چاہوں گا۔ فلمی گیتوں سے وطن پرستی کا جو جذبہ سامنے آیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے' کچھ گیت کاروں نے اس موضوع کو اپنا موضوع بنایا اور اسے اپنے گیتوں میں سمیٹنے کی کوششیں بھی کیں اور اس کوشش میں بیشتر گیت کاروں نے گیت کو تقریر کے قریب کر دیا۔ لیکن کیفی نے جہاں اس موضوع کو اپنے ذمے لیا اسے بڑی خوبصورتی اور کمال کے ساتھ نبھایا' آج ان کے کئی گانے ایسے ہیں جن کی وجہ سے وہ فلم یاد کی جاتی ہے' جبکہ ہوتا یہ ہے کہ فلم کے حوالے سے گیت یاد کئے جاتے ہیں' مگر ان کے نغموں کا معاملہ ہی برعکس نظر آتا ہے۔ میرا اشارہ اس گانے کی طرف ہے جس کی وجہ سے ''حقیقت'' فلم یاد کی جاتی ہے۔ اس فلم میں کیفی کے تین گانے ہیں' تینوں گانے بہت مقبول اور کامیاب ہوئے۔ کئی دہائی کے بعد بھی اس کی مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ وطن پرستی سے متعلق گانے کا یہ بند ملاحظہ ہو:

کھینچ دو اپنے خوں سے زمیں پر لکیر
اس طرف آنے پائے نہ راون کوئی
توڑ دو ہاتھ گر ہاتھ اٹھنے لگے
چھونے پائے نہ سیتا کا دامن کوئی
رام تم ہی' تم ہی لکشمن ساتھیو
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو

کیفی کی وطن پرستی کی یہ ان مٹ چھاپ صرف اس گانے تک ہی محدود نہیں۔ دوسرے کئی گانے ایسے ہیں جو نہایت پر اثر انداز میں ہمارے جذبات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ مثلاً:

ہندوستان کی قسم' ہندوستان کی قسم
نہ جھکے سر وطن کا' ہر جوان کی قسم

پھر امتحاں نہ ہوگا یوں امتحان دیں گے
کھائیں گے زخم ہنس کر خوش ہو کے جان دیں گے
مٹ جائیں گے زباں پر جب ہم زبان دیں گے

ہے اسی میں شان اپنی' اسی شان کی قسم
ہندوستان کی قسم' ہندوستان کی قسم

کیفی نے جس طرح اپنی شاعری میں انسانی رشتوں کا خیال رکھا' ان کے دکھ درد کو سمجھا اور ان کے ٹوٹنے بکھرنے کے مرحلے کو محسوس کیا ہے' یا زندگی کے سپید و سیاہ لمحات کا احاطہ کیا ہے۔ یہ صرف ان کی مخصوص شاعری کا حصہ نہیں' بلکہ انہوں نے اس فلسفے کو اور اس کی تمام کیفیات کو اپنے گیتوں میں بھی ڈھالا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نغموں میں ایک عجیب کسک اور تڑپ کا انوکھا احساس پایا جاتا ہے۔ میری باتوں کی صداقت اور زندگی سے متعلق ان کا فلسفہ آپ ان گیتوں میں محسوس کر سکتے ہیں۔ فلم ہے ''کاغذ کے پھول'':

وقت نے کیا' کیا حسیں ستم
تم رہے نہ تم' ہم رہے نہ ہم
جائیں گے کہاں سوجھتا نہیں
چل پڑے مگر راستہ نہیں
کیا تلاش ہے کچھ پتہ نہیں
بُن رہے ہیں دل خواب دم بہ دم

دوسرا گیت ملاحظہ ہو:

دیکھی زمانے کی یاری بچھڑے سبھی باری باری
اڑ اڑ جا پیاسے بھنورے
رس نہ ملے گا خاروں میں
بیٹھ نہ ان گلزاروں میں
نادان تمنا رہتی ہے
امید کی کشتی کھیتی ہے
اک ہاتھ سے دیتی ہے دنیا
سو ہاتھ سے لے لیتی ہے

کیفی نے جہاں اپنے نغموں میں محبت کا اظہار کیا ہے' فرقت اور قربت کے لمحات کو شاعری میں ڈھالا ہے اور دلوں کو چھونے والے نرم و نازک احساس کو جہاں مس کیا ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ آج بھی ان نغموں کے بول پر دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے اور خوشی و غم کی ایک ملی جلی کیفیت دل کا دامن کھینچنے لگتی ہے۔ فلم 'حقیقت' سے دو نغموں کے بند ملاحظہ فرمائیں:

میں یہ سوچ کر اس کے در سے اٹھا تھا
کہ روک لے گی منا لے گی مجھ کو

ٹارچ لئے کھڑے ملے۔ ٹیکسی رک گئی' انہوں نے بڑھ کر پوچھا کہ آپ کیفی صاحب .....! میں، جی، ہاں کہتے ہوئے ٹیکسی سے اترا، ایک آدمی مجھے لے کر احاطے میں داخل ہوا اور دوسرا میرا سامان لئے پیچھے سے پہنچا۔ کیفی صاحب باہر لان میں بیٹھے شاید میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ بڑے پر جوش انداز میں مجھ سے ملے' تھوڑی دیر سفر کے سلسلے میں رسمی گفتگو ہوتی رہی۔ پھر انہوں نے فریش ہونے کے لئے کہا' فریش ہوکر تھوڑی دیر میں پہنچا ہی تھا کہ کھانا آ کر لگ گیا' کھانے کے بعد ادب پر گفتگو ہوتی رہی پھر انہوں نے جابر حسین صاحب کے بارے میں پوچھا' دستاویز' اور 'خبرنامہ' کی تعریف کی اور کہا کہ وہ شخص بہار میں اردو کے لئے بہت کام کر رہا ہے۔ کھانے کے بعد مجھے آرام کرنے کو کہا گیا کہ صبح باتیں ہوں گی۔

صبح میں لگ بھگ آٹھ بجے فریش ہوکر لان میں پہنچا تو دیکھا کہ کیفی صاحب باہر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھ۔ قریب جانے پر دیکھا کہ سر پہ کالی ٹوپی اور ماتھے پر ایک لمبا تلک بھی ہے۔ میں حیران تھا کہ ایک مسلمان کے ماتھے پر تلک؟ اس وقت میرا تحقیقی مقالہ میرے ہاتھوں میں تھا' مجھے دیکھتے ہوئے بولے' آیئے ڈاکٹر صاحب' میں بیٹھ گیا' تحقیقی مقالہ میرے ہاتھ سے لے کر اپنی گود میں رکھا اور ورق پلٹنے لگے' میں ان کے چہرے کی کیفیت دیکھ رہا تھا' آنکھیں خوشی سے چھلک آئی تھیں' چہرے پر ایک عجیب وغریب کیفیت نمایاں ہو رہی تھی' انہوں نے کہا کہ آپ نے مقالے پر کافی محنت کی ہے۔ کیفی صاحب کی طبیعت اس وقت خراب تھی' اس لئے مقالے کا کچھ حصہ میں ہی انہیں پڑھ کر سنانے لگا' میں پڑھتا رہا اور وہ دلچسپی کے ساتھ مقالے کا اہم حصہ سنتے رہے۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ آپ نے بہت باریک بینی سے میرا مطالعہ کیا ہے اور بہت محنت کی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ اردو ادب کو ایک اچھا ناقد مل رہا ہے۔

دوپہر کھانے کے بعد دیکھا کہ ان کی امبیسڈر کار آ کر لگی' اور وہ ویل چیئر سے کار تک پہنچے' گھر کے دو آدمی سدانند اور دوسرے کا نام شاید گوپال تھا۔ انہیں پکڑ کر کار میں بٹھایا۔ میں سمجھا کہ وہ ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ آرام کریں' میں تھوڑی دیر میں لوٹتا ہوں۔ ان کے جانے کے بعد میں نے پوچھا کہ کیفی صاحب کہاں گئے؟ اس آدمی نے بتایا کہ لبا (وہ آدمی کیفی صاحب کو لبا کہتا تھا) جو اسکول بنوا رہے ہیں' اسے دیکھنے گئے ہیں' میری بے چینی بڑھ گئی' میں نے پوچھا اسکول کہاں ہے؟ اس نے بتایا کہ بغل ہی میں ہے۔ میں اس آدمی کو لے کر پیچھے سے اسکول پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا کہ آپ بھی آ گئے۔ میں پریشانی کی وجہ سے آپ کو نہیں لایا۔ یہ چھوٹا سا اسکول گاؤں کے بچوں کے لئے بنوا رہا ہوں' وہ اسکول چھوٹا نہیں تھا' اچھی خاصی بلڈنگ تھی۔ پھر ہم دونوں

ہواؤں میں لہراتا آتا تھا دامن
کہ دامن پکڑ کر بٹھالے گی مجھ کو
قدم ایسے انداز سے اٹھ رہے تھے
کہ آواز دے کر بلا لے گی مجھ کو

ہو کے مجبور ہمیں اس نے بھلایا ہوگا
دل نے کچھ ایسے بھی افسانے سنائے ہوں گے
اشک آنکھوں نے پیئے اور نہ بہائے ہوں گے
بند کمرے میں جو خط میرے جلائے ہوں گے
ایک اک حرف جبیں پر ابھر آیا ہوگا

فلم ''ہیر رانجھا'' کا یہ گیت دیکھیں:

ملو نہ تم تو ہم گھبرائیں، ملو تو آنکھ چرائیں
ہمیں کیا ہو گیا ہے، ہمیں کیا ہوگیا ہے

یا فلم ''ارتھ'' کا یہ نغمہ سنیں:

اک ذرا ہاتھ بڑھائیں تو پکڑ لیں دامن
اس کے سینے میں سما جائے خود اپنی دھڑکن

کیفی کے فلمی نغمے انسانی احساسات اور جذبات کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کیفیات اور احساسات کی فوٹو گرافی کیمرے سے ممکن نہیں ہے۔ اسے ممکنات کی حد تک شاعری میں ہی پیش کیا جا سکتا تھا۔ اس کی ترجمانی کے لئے شاید کوئی دوسرا فن اتنا موثر نہ ہو، جتنی کہ شاعری، آپ خود یہ نغمہ سنیں اور محسوس کریں کہ کیا کوئی کیمرہ ایسا ہے جو ان کیفیات کو اجاگر کر سکے:

آج سوچا تو آنسو بھر آئے، مدتیں ہو گئیں مسکرائے
ہر قدم پر ادھر مڑ کے دیکھا ان کی محفل سے ہم اٹھ تو آئے

کیفی نے کہیں بھی اپنے فن سے سمجھوتہ نہیں کیا اور نہ ہی بمبئی جیسے شہر سے ان کا کوئی سمجھوتہ ہو سکا۔ جہاں صرف سکے کھنکتے ہیں اور پیسہ بولتا ہے۔ کیفی کی فلمی شاعری کو ادب کی کسوٹی پر رکھ کر دیکھیں، یا ان نغموں سے میوزک اور آواز کو الگ کر کے دیکھیں، تو بھی ان کی کیفیت کم نہیں ہوتی۔ کیفی کی نظمیں ہوں یا نغمے ہر جگہ ان کا اپنا مخصوص رنگ حاوی ہے۔ کیفی کے دو چار فلمی نغمے اور ملاحظہ فرمائیں، جن سے

مذکورہ باتوں کی صداقت سامنے آئے گی۔

فلم ''شمع'':

اس جرم پر کہ ہم نے چاہا تھا مسکرانا
مرنے نہ دے محبت جینے نہ دے زمانہ
یہ سوچ کر بجھا دی خود شمع آرزو کی
شاید ہو روشنی میں مشکل نظر ملانا

جھکی جھکی سی نظر بے قرار ہے کہ نہیں
دبا دبا سا سہی دل میں پیار ہے کہ نہیں
وہ پل کہ جس میں محبت جوان ہوتی ہے
اس ایک پل کا تجھے انتظار ہے کہ نہیں

فلم ''ہیر رانجھا'':

شکل پھرتی ہے نگاہوں میں وہی پیاری سی
میری نس نس میں مچلنے لگی چنگاری سی
چھو گئی جسم میرا کس کے دامن کی ہوا
کہیں یہ وہ تو نہیں، کہیں یہ وہ تو نہیں

کیفی کے یہاں پرانی روایتوں سے بھی انحراف نظر آتا ہے۔ مگر وہ اتنے بھی منحرف نہیں ہو جاتے کہ وہ تمام پرانی قدروں کو پامال کر دیں۔ وہ انحراف کی ایک ایسی راہ تلاش کرتے ہیں جہاں پرانی تہذیبی و ثقافتی قدریں جھانکتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ روایتوں کو ایک حد تک رد یا قبول کرنے میں ان کا ذہن بہت متوازن نظر آتا ہے اور وہ کہیں بھی جبراً اپنے سیاسی و سماجی عقیدے کو اپنی شاعری پر اثر انداز ہونے نہیں دیتے۔ انہوں نے ہمیشہ ظلم کے خلاف آواز بلند کی اور اس آواز کو ہر جگہ خواہ وہ ادبی میدان ہو یا فلمی دنیا، بہت محتاط انداز میں پہنچانے کی سعی کرتے رہے۔ ان کا یہ احتجاج فلمی نغموں میں بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً:

ہاتھوں میں کچھ نوٹ لو، پھر چاہے جتنے ووٹ لو
کھوٹے سکے کھوٹا کام کرو، باپو کو نیلام کرو
باپو باپو کرتے رہو، زہر دلوں میں بھرتے رہو

پرانت پرانت کو تنگ کرے، بھاشا سے بھاشا جنگ کرے
سب کو چاہئے اپنی زمیں، ہندوستانی کوئی نہیں

یا پھر کیفی کا یہ نغمہ سماج کے منہ پر ایک زناٹے دار طمانچہ ہے:

ہم کو انسان میں ہے خدا کی تلاش
تم تجوری میں اس کو ڈھونڈتے ہو
یہ تمہارے گھڑی گھڑی کے سجدے
یہ تمہاری گھڑی گھڑی کی پوجا
ایک رشوت ہے بندگی کیا ہے
کوئی سوچے کہ زندگی کیا ہے

مذکورہ نغموں میں کیفی کا مخصوص رنگ اور اس کا جواز بہت نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ انہوں نے یہاں بھی اپنے فلسفۂ حیات کو شامل کر دیا ہے۔ لہٰذا ان کے نغمے ہمیں دور کی نہیں، بلکہ بہت پاس اور اندر کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے کیفی کی فلمی اور ادبی دونوں حیثیت مسلم ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

■■■

ردّ ونقد

■

ہر دور میں کوئی نہ کوئی فنکار ایسا ضرور ہوتا ہے' جس کا مطالعہ اس پورے دور کا مکمل اور بھرپور مطالعہ ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو بعض فنکار صدیوں کا نمائندہ بن جاتا ہے' جیسے امیر خسرو۔ اگر ہم گزشتہ ایک ہزار سال کی تاریخ کا جائزہ لینا چاہیں اور خصوصیت سے اس مدت کے ثقافتی' ادبی اور کلچرل ورثے کی زندہ اور جیتی جاگتی تصویر دیکھنا چاہیں تو ہمیں امیر خسرو کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اسی طرح انیسویں صدی کی متاثر کرنے والی تصویریں ہمیں غالب کے یہاں ملتی ہیں۔ خسرو اور غالب دونوں زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں' اور دونوں ہی آنے والے عہد کے بھی شاعر ہیں۔ اسی لئے میں نے اپنے مضمون کا آغاز اس جملے سے کیا کہ بعض فنکار اپنی خصوصیات کی بنا پر اپنے دور کے نقیب اور صدیوں کا نمائندہ بن جاتا ہے۔ اگر ہم انہیں نظر انداز کر دیں تو ہمارا جو خاکہ بنے گا وہ دھندلا ہوگا' جو تصویر سامنے آئے گی' وہ بے رنگ ہوگی اور ہمارا علم بھی ادھورا رہ جائے گا۔

میں نے اپنی تحقیق کے دوران جو تقریباً بیسویں صدی پر محیط ہے' یہ محسوس کیا کہ کیفی اعظمی کو نظر انداز کر کے' نہ تو ادب کی ترقی پسند تحریک کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اور نہ اشتراکی ادب کے تخلیق کاروں کا جائزہ مکمل ہوگا اور نہ اس روایت سے ہماری واقفیت ہوگی جو اقبال اور جوش کے بعد ترقی پسندوں کے ذریعے عروج پر پہنچی۔ اقبال کے یہاں دو باتیں وضاحت سے ملتی ہیں۔ ایک انسانی عظمت کا احساس' اور دوسری غلامی اور ظلم کے خلاف ان کا احتجاج۔

میں نے جب بھی ترقی پسندوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی' یہ محسوس کیا کہ ان کا فکری اور جذباتی سرچشمہ کہیں نہ کہیں اقبال سے مل جاتا ہے اور بعد میں جوش کی گرج دار آواز ان کی فعالیت کا سبب بنتی ہے۔ پوری ترقی پسند شاعری کو اقبال اور جوش نے مشترکہ طور پر متاثر کیا ہے۔ بلاشبہ متعلقہ عہد اور اس کے بعد کے فنکاروں نے اس کا اعتراف نہیں کیا۔ اب علی سردار جعفری علی الاعلان اس کا اعتراف کرتے ہیں' اور اقبال اور جوش کی فضیلتوں کے قائل ہیں۔

کیفی اعظمی کا تعلق ترقی پسند تحریک کے ابتدائی شعراء سے ہے۔ یہ وہ دور ہے جب دو چیزیں

ادب کے پیش نظر تھیں۔ ایک کا تعلق ہندوستان کی غلامی سے تھا اور دوسرے کا تعلق ایک ایسے آفاقی نظام سے تھا' جس کے طلوع ہونے کو اقبال نے آفتاب تازہ سے بشارت دی تھی۔ یہ دونوں باتیں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۶۰ء تک کسی نہ کسی شکل میں حاوی رہیں۔ البتہ ان کے رنگ روپ بدلتے رہے۔ ۱۹۴۷ء تک تحریک آزادی دوسرے شاعروں کی طرح کیفی کا بھی محبوب موضوع بنا' اس کے بھی دو نمایاں پہلو ہیں۔ ایک کا تعلق اس جدوجہد سے ہے جو غیر ملکیوں کے اخراج کے لئے کی جارہی تھی اور دوسرے کا تعلق ملک کی اس تقسیم سے ہے' جو فرقہ پرستوں اور ناعاقبت اندیش سیاسی رہبروں کی وجہ سے وجود میں آئی۔ اس عہد کے بیشتر نمائندہ شاعروں نے اس دور میں آزادی کا خیر مقدم نہیں کیا۔ اس معاملے میں کیفی بھی پیچھے نہیں رہے۔ انہوں نے بھی اس آزادی کو ابتدائی دور میں تسلیم نہیں کیا' اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ کیفی ایک سیاسی پارٹی کے فعال رکن تھے اور جس کے منشور سے ہٹ کر کیفی کے لئے کچھ کرنا مشکل تھا پھر آزاد ہندوستان کا جو خواب تھا اس کی تعبیر بھی تو سامنے نہیں آئی تھی۔

کیفی کی شاعری پر کچھ لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ ان کے یہاں جذباتی ابال زیادہ ہے' اور ان کی فکر پر سیاست اور انسان دوستی اس درجہ حاوی نظر آتی ہے کہ وہ شاعری کے بنیادی تقاضوں کو کہیں کہیں پس پشت ڈالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگر یہ بات مان بھی لیں کہ اپنے اس ہنگامی دور میں وہ فن کے جمالیاتی حسن کو نظر انداز کرتے ہیں' تو وہاں بھی ان کی انسان دوستی اہم ترین تخلیقی محرک کی حیثیت سے ابھرتی ہے' اور اپنے معاصرین میں ایک معتبر آواز بن جاتی ہے۔ یہ لب ولہجہ ہمیں جوش کی یاد دلاتا ہے یا ایک انقلابی مفکر کا تصور ذہن میں ابھارتا ہے جس کے دل و دماغ میں غلامی کے خلاف ایک قسم کی بے چینی ہے اور اس بے چینی میں ایک قسم کا احتجاج بھی شامل ہے۔ یہ احتجاج کبھی کبھی جھنجھلاہٹ میں بدل جاتا ہے مگر احتجاج اپنی پوری قوت کے ساتھ باقی بھی رہتا ہے۔ جوش کے یہاں احتجاج کی نوعیت رومانوی ہے' اقبال کے یہاں فکری اور ترقی پسند شاعروں کے یہاں ان دونوں کی ملی جلی شکلیں ملتی ہیں۔ احتجاج زندگی کی علامت ہے' ناآسودگی کا اظہار ہے اور اپنے حال کو ایک خوشگوار مستقبل میں بدلنے کی آرزو بھی ہے۔ کیفی کی شاعری صدائے احتجاج سے لیس ہے۔ ممکن ہے اہل قلم اسے ہنگامی حالات کی شاعری قرار دیں' یا زیادہ سے زیادہ اسے تاریخی حادثات کی ترجمانی تصور کریں' اور یہ کہہ کر کیفی کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن کیفی کی شاعری کے اس حصے کا جسے بعض جذباتی ابال کی دین تصور کرتے ہیں' کا مطالعہ ہمارے لئے اس وقت ضروری ہو جاتا ہے۔ جب ہم اس نتیجے پر پہنچنا چاہتے ہیں کہ سماجی اور سیاسی بیداری کی کس سطح پر اس وقت اردو کے فنکار سانس لے رہے تھے' اور وہ کون سے سماجی محرکات تھے' جو ان کی تخلیقات کا سبب بنے ہوئے تھے۔ یہ مطالعہ اس اعتراض

کو بھی القط کرنے میں مدد دیتا ہے' کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم دانشوروں' فنکاروں کا کوئی نمایاں رول نہیں تھا۔

ایک عرصے تک ترقی پسند شاعری پر یہ اعتراض کیا جاتا رہا کہ یہ پروپگنڈہ ہے' اور پروپگنڈہ ادب نہیں ہوتا۔ بعض معترضین جن اصولوں کی روشنی میں ترقی پسند شاعری کو پروپگنڈہ سمجھتے ہیں' وہ اقبال کی شاعری کو بھی اسی ضمن میں رکھتے ہیں۔ حالانکہ اس کا اظہار نہیں کرتے۔ ''اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو'' اس نعرہ بازی سے بہت دور نہیں ہے' جو ترقی پسندوں کے یہاں بالکل ابتدائی دور میں سنائی دیتی ہے۔ للکار کی یہ آواز اقبال کے یہاں واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔ یہ صرف ایک نظم نہیں بلکہ اقبال کی کئی نظموں کا مزاج ہے۔ جس طرح انہوں نے انسان کی عظمتوں کو ظاہر کیا' ان کی ثنا خوانی کی' اور ان کی خلاقانہ قوت کا اظہار کیا' وہ سب معترضین کے نزدیک فطری طور پر پروپگنڈہ کے دائرے میں آجاتا ہے۔ اقبال کی پوری شاعری قرآن اور حدیث کی روشنی میں اسلام کا پروپگنڈہ نہیں تو کیا ہے' جہاں شروع سے آخر تک مقصدیت کا اظہار ہوا ہے' مگر اقبال پر ان کا یہ اعتراض کبھی سامنے نہیں آیا۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا' کہ وہ ایک قدآور شاعر ہیں۔ لہٰذا کسی میں اتنی جرأت پیدا نہ ہوسکی کہ اقبال کی شاعری کو محض پروپگنڈہ کہہ کر مطعون کردے۔

دراصل پروپگنڈہ اور ادب کی بحث بڑی پرانی ہے۔ کورڈویل نے اپنی کتاب Illusion and reality میں اس فرق کی وضاحت بہت خوبصورتی سے کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پھول اور پھول کی پنکھڑی ہمارے نزدیک ایک ہی معلوم ہوتی ہے لیکن ماہر نباتات کے یہاں اس کی حیثیت جداگانہ ہے۔ کسی صاحب نظر کا یہ قول ہے کہ ''ادب بہترین پروپگنڈہ ہے'' لیکن بہترین پروپگنڈہ ادب نہیں ہے' ہم دنیا کی اعلیٰ ترین کتابوں اور مذہبی صحیفوں کو بھی جو ادب عالیہ کے بہترین نمونے ہیں' پروپگنڈے سے الگ قرار نہیں دے سکتے۔ مثلاً انسانوں کو تاکید کی گئی کہ وہ سچ بولے' کسی کو قتل نہ کرے' کمزوروں کے ساتھ انصاف کرے' یہ سب اقدار کی حیثیت رکھتی ہیں' اور تقریباً ہر مذہب کے اخلاقی نظام میں ان کی بڑی اہمیت ہے۔ ان سبھوں کا اظہار براہ راست بھی ہوا ہے' اور علامتی زبان میں بھی' تو کیا ہم اسے پروپگنڈہ کہہ کر نظر انداز کرسکتے ہیں؟

ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ادب کی تخلیق اسی دنیا میں ہوتی ہے۔ وہ براہ راست یا بالواسطہ ہمارے بارے میں سب کچھ بیان کرتا ہے۔ کہیں یہ بیان کھردرا ہوتا ہے' کہیں اشارات میں ڈوبا ہوا' کہیں علامتوں کے اعتبار سے اور کہیں محض جذباتی انداز میں سامنے آتا ہے۔ دراصل تصورات اور افکار کی دنیا جس طرح فنکار کے ذہن میں جنم لیتی ہے' اس کے اظہار کے لئے اس کے پاس بجز الفاظ

کوئی اور وسیلہ نہیں ہوتا۔ اب یہ الفاظ کی سواری ہوتی ہے' جو اس کے خیالات کو بہا کر ہم تک پہنچاتی ہے۔ اگر فنکار الفاظ کے استعمال پر قدرت نہیں رکھتا ہے' یا پھر جذبات کے اظہار پر دسترس اور تخلیقی حس سے وہ آشنا نہیں ہے تو اس کا بیان یقیناً بے اثر ہوگا۔

ترقی پسند شاعری کے ابتدائی دور میں بعض شاعروں کے یہاں ایسی مثالیں ملتی ہیں' جن میں براہ راست انداز بیان اختیار کیا گیا ہے جہاں شاعرانہ محاسن کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ تاریخ میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے' جب فنکار کے مخاطب عام آدمی ہوتے ہیں۔ اور جب عام آدمی سے گفتگو کی جاتی ہے تو ان کی زبان اور انہیں کے اسلوب استعمال ہوتے ہیں۔ کیفی کا عہد ایسا ہی تھا' پورا ملک جنگ آزادی کی آگ میں جل رہا تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ آزادی کے شعلے کو اور ہوا دی جائے' اور ہندوستان کی پوری آبادی غلامی کے خلاف ایک ہو کر جنگ میں کود پڑے۔ اس لئے کیفی کے لئے مناسب نہیں تھا کہ وہ استعاروں' کنایوں سے کام لیتے اور غزل کا روایتی لب و لہجہ اختیار کرتے۔ کسی بھی ملک کی آزادی کی تاریخ اٹھالیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس ملک کے فنکاروں نے جو تخلیقی رویہ اختیار کیا' وہ کیفی سے کوئی مختلف نہیں ہے۔ یہ صرف کیفی کا انفرادی تخلیقی رویہ نہیں تھا' بلکہ یہ تمام ترقی پسند ادیبوں کا تخلیقی رویہ تھا۔ نثر میں اس کی ایک زندہ مثال کرشن چندر ہیں' کرشن چندر نے دوسرے ترقی پسند ادیبوں کی طرح فساد پر بہت کچھ لکھا' اور شاید وہ اکیلے فنکار ہیں' جنہوں نے ایک محاذ بنا کر لکھا' ہم وحشی ہیں' کرشن چندر کا کوئی لازوال کارنامہ نہیں ہے' لیکن فساد زدہ ماحول کی بڑی خوبصورت عکاسی اس کتاب میں ملتی ہے' اور کرشن چندر کا انسان دوست رویہ بھی یہاں سامنے آجاتا ہے۔ یہ بات ترقی پسندوں کے دشمنوں کو پسند نہیں آتی۔ لہٰذا کبھی کبھی بعض حلقے سے اب بھی یہ آواز سنائی دیتی ہے' کہ کرشن چندر ایک Non Writter ہیں۔ سعادت حسن منٹو نے بھی بعض افسانے ایسے لکھے ہیں' جنہیں بہت آسانی سے آپ پروپگنڈے کے دائرے میں لے جاسکتے ہیں۔ لیکن نہ اس سے سعادت حسن منٹو کے فن پر اثر پڑتا ہے اور نہ ان کی عظمت میں کسی طرح کی کمی واقع ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ اعتراض وقیع نہیں معلوم ہوتا کہ کیفی اعظمی کی شاعری کا وہ حصہ جو سیاست یا جنگ آزادی سے متعلق ہے' پروپگنڈہ یا نعرہ بازی کی نذر ہو گیا ہے' اور وہ اس چیخ و پکار کے قریب آگیا ہے' جو سیاسی لیڈروں کو تو زیب دیتی ہے لیکن ادیبوں کو نہیں۔ گزشتہ ابواب میں اس قسم کی تحریر سے متعلق تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ بہر حال دلچسپ بات یہ ہے کہ ایسی مثالیں فیض کی شاعری میں بھی ملتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود فیض ہمارے عہد کے ایک ممتاز شاعر تسلیم کئے گئے ہیں۔ دیانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ جب ہم کسی شاعر کے کمزور پہلوؤں کو سامنے رکھیں' تو ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ کمزور پہلو ان کی شاعری کا صرف ایک حصہ ہے' یا اس حصے

میں ان کی پوری شاعری ڈھک گئی ہے۔ آپ کسی بھی ترقی پسند شاعر کے یہاں خواہ وہ فیض ہوں یا سردار، جاں نثار ہوں یا مخدوم آپ ان کے عہد کی سچائیاں تلاش کر سکتے ہیں، حادثات و واقعات کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور ہنگامی صورت حال کا مشاہدہ بھی کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے ان کی شاعری کا ایک حصہ ہی وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے سے تعلق رکھتا ہوگا، تو کیا ویسی شاعری کو صریحاً نظر انداز کر دینا مناسب ہوگا؟ جبکہ اس حصے کی بیشتر تخلیقات اپنے تمام تخلیقی جوہر اور فنی محاسن کے ساتھ سامنے آئی ہوں، جس میں زندہ اور مثبت اقدار کے چہرے بھی واضح ہو گئے ہوں، کیا اس طرح کی شاعری سے چشم پوشی کرنا ایک غیر منصفانہ عمل نہیں ہوگا۔ مذکورہ تمام شعراء کے یہاں ہنگامی موضوعات سے متعلق بہترین تخلیقات مل جائیں گی مثلاً مخدوم، فیض اور سردار کی نظمیں 'چاند تاروں کا بن' صبح آزادی' اور 'اناج' یا پھر کیفی کی نظمیں کرن، چراغاں اور لال جھنڈا وغیرہ ڈھیر ساری نظمیں دیکھی جا سکتی ہیں، جو آج بھی ہمیں شعری محاسن سے مسحور کر دیتی ہیں، جو موجودہ عہد کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ ظاہر ہے جب ہم اس نقطۂ نظر سے کیفی کی شاعری کا جائزہ لیں گے تو حقیقت الزام کے برعکس ملے گی۔ ان کی شاعری کا وہ قابل اعتراض حصہ بھی اپنے عہد کے نہ صرف تقاضوں سے عبارت ہے بلکہ شاعرانہ کمالات سے مزین بھی ہے۔

یہیں پر ایک نکتہ یہ پیدا ہوتا ہے، کہ کیا ہنگامی شاعری کا کوئی حصہ آفاقی شاعری کا جزو بنتا ہے؟ اس سوال کا جواب اس وقت آسان ہو جائے گا، جب ہم آفاقی شاعری کے عناصر کا جائزہ لیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ شاعری آفاقی ہو یا غیر آفاقی ہو، اگر وہ معیار کی ایک سطح پر تخلیق کی جاتی ہے تو شاعر کے عالم تخیل کی خوبصورت مثالیں پیش کرتی ہے۔ کبھی کبھی آپ کو سیاسی اور ہنگامی شاعری کا بھی ایک حصہ ایسا ضرور مل جائے گا جو شاعری کی آبرو بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر تعصّبات کی عینک ہٹا کر کیفی کی احتجاجی شاعری کا جائزہ لیں، تو ہمیں یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ نعرہ بازی اور پروپگنڈے سے ہٹ کر بھی انہوں نے ہنگامی موضوعات پر ایسی نظمیں یقیناً تخلیق کی ہیں، جن میں شاعر کا تخیّل اظہار تمام جمالیاتی تقاضوں کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے، اور یہی وہ حصہ ہے جو اچھی اور زندہ رہنے والی شاعری کا جزو بنتا ہے۔

کیفی کا سیاسی اور سماجی شعور ادب کے اسی بنیادی مسئلے سے ابھرتا ہے کہ کمٹمنٹ کیا ہے؟ اور کس حد تک فنکار کمیٹیڈ ہوتا ہے۔ جو لوگ کمٹ منٹ کا مذاق اڑاتے ہیں یا اسے تسلیم نہیں کرتے۔ وہ خود بھی کمیٹیڈ ہیں۔ البتہ اس کی شکل منفی ہے۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ آپ کسی چیز کو اچھی سمجھتے ہیں اور کسی چیز کو بری، ایک مشاق قاتل کے لئے قتل کا عمل اخلاقی اقدار سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ لیکن ایک

عام آدمی کے لئے اس کا تعلق اخلاقی اقدار سے ہے۔ اس کا نقصان بھی ہو جائے تو وہ قتل کے لئے آمادہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح وہ قدریں جو آفاقی ہیں اور جو کبھی نہیں بدلتیں، وہ فنکار کے نزدیک کمٹمنٹ کا مسئلہ پیدا کرتی ہیں۔ مثلاً انسان دوستی، محبت، رفاقت، ارتقاء، احترام آدمیت، حسن پرستی یہ سب ایسی قدریں ہیں جو ہر دور میں زندہ رہی ہیں، اور فنکار کی زندگی میں شب و روز ان کی اہمیت ہوتی ہے۔ اب وہ شاعر جو سماجی انصاف اور استحصال کے خلاف کمربستہ ہے، اس کے کمٹمنٹ کا آپ کس طرح مذاق اڑا سکتے ہیں۔ کیفی کے ساتھ یہی بات ہے۔ کیفی کا سیاسی شعور ان کے پورے عہد کے بائیں بازو کا سیاسی شعور ہے۔ میں اس احساس بیداری کا احترام کرتا ہوں اور اسے ان کی شناخت کا ایک عنصر تصور کرتا ہوں۔

کیفی کے مطالعے کے دوران یہ اعتراضات بھی سامنے آئے کہ ان کی شاعری میں خطابت ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں لیکن مزید تفصیل میں جانے سے پہلے یہ جان لینا یقیناً ضروری ہے کہ خطابت بھی ایک اعلیٰ فن ہے۔ عربی شاعری کا مطالعہ کیجئے تو اس کے اوصاف نظر آئیں گے۔ خطابت منظوم بھی ہوا کرتی ہے۔ اور خطیب کی حیثیت جادوگر سے کم نہیں ہے۔ اب اگر شاعر کے یہاں یہ جادوگری فن کا حصہ بن کر ابھری ہے، تو ہمیں اس کے طلسم کا اقرار کرنا ہی پڑتا ہے۔ کیفی کی شاعری کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے عوام الناس اور محنت کشوں کو ادب سے قریب کر دیا، عوام و خواص کے درمیان جو دیوار حائل تھی اسے گرادی، اور اس کے اندر زندگی کی ایک رمق پیدا کی، اسے اس کے وجود کا احساس دلایا، اور اس کے ہونے کا سبب بتایا اور یہ کام انہوں نے خطابت سے ہی انجام دیا۔ زندگی سے فرار اور بیزاری ان کے نزدیک ادب نہیں۔ محض ادب کے نام پر ایک سوانگ ہے۔ ان کی خطابت محض سپاٹ بیان یا تقریر نہیں، بلکہ ان کے یہاں لفظوں کی نشست و برخاست میں غنائیت اور آہنگ موجود ہے، جو قاری کے دل پر زبردست تاثر قائم کرتی ہے۔ دوسرے ابواب میں اس کی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ خطابت کیفی کے یہاں شاعری کا حسن ہے۔ یہ خطابت ہمیں اقبال اور جوش کے یہاں بھی ملتی ہے۔ مگر معترضین کو وہ حسن نظر آتا ہے، اور ترقی پسندی سے عصبیت، کیفی کے یہاں اسی حسن کو عیب میں بدل دیتی ہے۔

شاعری کیفی کا مذہب ہے، اور ہر مذہب کا ایک بانی ہوا کرتا ہے، پھر اس کے جانشیں اس کی خصوصیات کی تشریح و توسیع کرتے ہیں۔ کیفی کا مذہب انسان دوستی ہے، وہ اس کے بانی نہیں، لیکن وہ ایک مسیحا کا درجہ رکھتے ہیں، یہ مسیحائی محنت کش طبقے سے محبت کے طور پر ابھری ہے۔ اس محبت کی بنیاد محض جذباتی زندگی کا ابال نہیں ہے، بلکہ فکر و نظر کی گہرائی ہے۔ کیفی بھی غالب کی طرح زندگی کو ہر حال

ایک ساتھ ہی گھر لوٹے' میری بے چینی اس وقت اور بڑھ گئی تھی کہ آخر انہوں نے اپنے گاؤں کے لئے کیا کیا کام کیا ہے۔ میں ایک آدمی کو لے کر یہ سب دیکھنے کے لئے گاؤں میں نکل پڑا' تو اس آدمی نے مجھے بتایا کہ' انہوں نے اپنے گاؤں کے لئے بہت کام کیا ہے۔ اس ایک سڑک کی وجہ سے کئی گاؤں آباد ہو گئے۔ یہاں پہلے کچھ بھی نہیں تھا' آبادی بھی بہت نہیں تھی' مگر آج یہاں سب کچھ ہے' پانی' بجلی' دواخانہ' سڑک اور ڈاک خانہ وغیرہ کمپیوٹر سنٹر بھی کھلنے کی بات ہے۔ یہ سب کچھ ان کی محنت اور کوششوں کا ہی نتیجہ ہے۔ پہلے گاؤں کا یہ حال تھا کہ بارش کے دنوں میں کوئی گاؤں سے باہر اور کوئی گاؤں کے اندر آنے کی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بیمار آدمی کو کھاٹ پر بڑی مشکل سے اسپتال پہنچایا جاتا تھا۔ یہاں کے لوگ دوا کی وجہ سے دم توڑ دیا کرتے تھے۔ آج دواخانہ اور سڑک بن جانے کی وجہ سے ایک طرح سے گاؤں کے لوگ موت کے منہ سے لوٹ آئے ہیں۔ ان کی کوششوں سے پھول پور میں (شاید کھراسن) ریلوے اسٹیشن بنا۔ وہاں گاڑیوں کو روکنے کے لئے ویل چیئر لگا کر وہ ایک بار ریلوے لائن پر بیٹھ گئے تھے۔ آخر حکومت کو مجبور ہو کر وہاں ریل گاڑیوں کو روکنے کی اجازت دینی پڑی۔ اس سے گاؤں کے کسانوں کو بڑا فائدہ ہوا۔ اب یہ اپنا اناج آسانی سے ریل کے ذریعے بازار تک لے جاتے ہیں اور اپنے مال کو اچھی قیمت فروخت کرتے ہیں۔

میں اسی طرح گھومتے ہوئے اس جگہ بھی گیا' جو ان کا پرانا گھر تھا۔ وہ بالکل نئے گھر کے ہی بغل میں ہے۔ وہاں پہنچتے ہی میری آنکھوں کے سامنے وہ تمام منظر گھوم گئے۔ جو میں نے کتابوں میں پڑھا تھا' کیفی صاحب کا پورا بچپن میرے سامنے تھا' میں ان کے ماضی میں کھو گیا اور جب ماضی سے مستقبل میں لوٹا تو مجھے فخر محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے ایک ایسے آدمی پر اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا ہے' جو ایک دردمند انسان ہے اور دوسروں کے دکھوں کو اپنا دکھ سمجھنے والا صرف شاعر ہی نہیں' بلکہ ایک عظیم انسان بھی ہے۔ میں گاؤں میں ان کا کام دیکھ کر دنگ تھا' کہ ایک آدمی جسے ۱۹۷۳ء میں فالج مارا ہوا اور جس کے جسم کا آدھا حصہ بیکار ہو گیا ہو' جو بارہ گھنٹے برین ہمبرج میں رہا اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے جن کے پاؤں بھی ٹوٹ گئے ہوں' اس آدمی کا وہیل پاور کتنا مضبوط ہے۔ میں شاید اس طرح کا پہلا آدمی دیکھ رہا تھا جو جسم سے مجبور ہوتے ہوئے بھی کبھی مجبوروں اور اپنگوں کی طرح زندگی نہیں گزاری۔ جن کے حوصلے سے موت بھی آنکھیں چراتی رہی۔

شام گھر پہنچتے ہی ان پر میری نگاہ پڑی تو میں خود کو ایک عجیب کیفیت میں مبتلا پایا۔ فخر' خوشی اور محبت کی ایک ملی جلی کیفیت نے ان کی عظمت کو بہت بلند کر دیا تھا۔ رات کھانے پر ان سے کچھ کچھ پوچھتا رہا' اور وہ بتاتے رہے۔ میں ان سے زیادہ اس لئے بھی بات نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ بیمار تھے،

میں ترجیح دیتے ہیں۔ جب جب کوئی اس کی تحقیر کرتا ہے تو کیفی کا قلم چیخ اٹھتا ہے۔ اس چیخ میں کوئی ہذیانی کیفیت نہیں ہے' بلکہ بیداری کا نغمہ چھپا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں آرائش غم کا کل اور اندیشہ ہائے دور دراز کی تصویر کم ملتی ہے۔

احتجاج ادب سے ہو' سماج یا معاشرے سے ہو یا فرسودہ روایت سے' احتجاج کی اساس ہمیشہ عظیم تبدیلیوں سے عبارت ہوتی ہے' اور یہی وجہ ہے کہ احتجاج کرنے والا اپنی آواز کا سر اونچا رکھتا ہے اور کبھی غیر جانبدار نہیں ہوتا' وہ سچ کے ساتھ نظر آتا ہے۔ ظالم کے مقابلے مظلوم کا انتخاب کرتا ہے اور ہر محاذ پر اسی کا دم بھرتا ہے۔ اسی کے خوابوں' امنگوں اور عظمتوں کے نغمے گاتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے نغموں میں طنز کی کاٹ گہری ہوگی' اور طنز کی یہ گہری کاٹ اور اس کی معنویت' اسے آگہی کے عرفان سے حاصل ہوتا ہے' اور یہ عرفان کیفی کو حاصل ہے۔ لہٰذا ان کا طنز ان کے عہد کے فرسودہ نظام اور اس نظام سے وابستہ انسانیت کش قدروں اور سیاسی ناہمواریوں سے برہمی کا نتیجہ ہے' اور یہ برہمی یونہی نہیں ہے' بلکہ اپنے عہد کے طبقاتی مساوات' سماجی حقائق اور انسانی اقدار سے مضبوط اور ایک اٹوٹ رشتے کی وجہ سے ہے' جس کے حصول اور حقوق کے تحفظ کے لئے ہی ان کی چیخ بلند ہوتی ہے' اور ان کا احتجاج سامنے آتا ہے' جو عوام کی دھڑکن بن کر فتح مندی کی نوید دیتا ہے۔ میں نے کیفی کی انسان دوستی کا تذکرہ بار بار کیا ہے۔ لیکن یہ بات ذہن میں ضرور رہنی چاہئے کہ محض انسان دوستی کا جذبہ اچھی شاعری کو جنم نہیں دیتا۔ شاعری کی بنیادی صفت یہ ہے کہ وہ سچائیوں کو نئی شکل وصورت بھی عطا کرے۔ کیفی کی شاعری میں یہ بنیادی صفت موجود ہے جو ہماری انسان دوستی اور دردمندی کو بیدار کر کے زندگی کا ایک مثبت رخ سامنے لاتی ہے۔

بعض ترقی پسند شاعروں نے انسان دوستی اور اپنی سیاسی حکمت عملی کی خاطر اچھے اور اعلیٰ ادب کی خصوصیات کو پس پشت ڈال دیا۔ کیفی نے ایسا نہیں کیا وہ کلاسک ادب سے اچھی طرح واقف ہیں' ہماری اعلیٰ ادبی وتہذیبی روایت سے بھی آشنا ہیں۔ انہیں اس کا بھی احساس ہے کہ اچھا اور بڑا شاعر اپنے ادبی روایات سے نہ صرف واقف ہوتا ہے' بلکہ اسے بروئے کار لانے میں قدرت بھی رکھتا ہے۔ یعنی وہ ان روایات کی تقلید یا پیروی نہیں کرتا' بلکہ ایک نئی روایت تخلیق کرتا ہے۔ اقبال پہلے شاعر ہیں جنہوں نے غزل کی روایت کی ایک نئی طرح ڈالی اور سارے مضامین جو غزل کے لئے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتے تھے' اقبال کے یہاں نئی آب وتاب کے ساتھ سامنے آئے اور کامیاب شاعری کا ایک حصہ بنے۔ کیفی کو اس حقیقت کا علم تھا۔ لہٰذا انہوں نے بھی اپنی شاعری کو حتی الامکان ایک نیا موڑ دینے کی کوشش کی جہاں وہ ایک حساس طبیعت اور متوازن فکر سے لیس نظر آتے ہیں۔

کیفی کی مجموعی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے بعض چیزیں ایسی ملیں جن سے اندازہ ہوا کہ ان کی نظر ماضی، حال اور مستقبل یعنی وقت اور وقت کی رفتار پر مرکوز ہے۔ ماضی کی روایتوں، حال کے مسئلوں اور مستقبل کی امیدوں نے کیفی کی شاعری کو جلا بخشی اور انسانی امکانات سے مہمیز کیا۔ اس لئے ان کی شاعری کا موضوع صرف ذات یا صرف کائنات نہیں بلکہ دونوں ہیں، اور یہ کہاں ممکن ہے کہ کوئی آدمی کائنات کا نعرہ بلند کرے اور خود اپنی ذات سے ہی بے خبر ہو جائے۔ کیفی نے مڑ کر ماضی کو دیکھا ہے، ماضی سے کوئی آدمی اپنا رشتہ نہیں توڑ سکتا۔ ماضی کی ہر شئے نہ خراب تھی نہ اچھی، کیفی اس کا شعور رکھتے ہیں۔ وہ پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھتے تو ہیں، لیکن اس لئے نہیں کہ وہ ماضی پرست ہیں، بلکہ اس لئے کہ وہ آج کی بدلتی ہوئی نئی قدروں کا ان سے موازنہ کر سکے، یہ وہ شعور بھی رکھتے ہیں کہ کل کا انسان بہت دکھی تھا، جاگیردارانہ دور میں آدمی غلام تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں یہ غلامی ختم ہوئی، اسے تھوڑی آزادی ملی، فکر و شعور کی قندیلیں جلیں، البتہ معاشی استحصال کی ایک نئی صورت سامنے آئی۔ کیفی نے اپنی نظموں کے ذریعے زندگی کے ان نئے مسائل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کی تمام ہمدردیاں محنت کشوں، کمزوروں اور کسانوں سے وابستہ ہیں، وہ ایک غیر طبقاتی سماج کے قائل ہیں۔ وہ اس رمز سے بھی آشنا ہیں کہ جب تک زندگی کا کوئی آدرش نہ ہو، زندگی محض گورکھ دھندہ بن کر رہ جاتی ہے۔ کیفی نے اپنی شاعری میں، اپنے آدرش کو بہت نمایاں کیا ہے۔ اسی لئے وہ مقصدی شاعری کا بہترین نمونہ اور فنکارانہ اظہار بن گئی ہے۔ کیفی اپنے عہد میں رونما ہونے والی واردات کو محض بصارت سے نہیں بصیرت سے بھی دیکھتے ہیں۔ واردات کو جس نے بصارت سے دیکھا، ان کی بصیرت نے ہوا میں کیل ٹھونکی اور انہیں ہوا کی کوئی نمی یا تپش محسوس نہیں ہوئی لیکن جس کسی نے اپنی بصارت میں بصیرت کو بھی شامل رکھا تو یہ محسوس کیا کہ:

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی

کیفی نے اپنی شاعری میں نہ صرف فن کے تقاضوں کو پورا کیا، بلکہ زندگی کے اہم تقاضوں کو پورا کرنے کی سعی بھی کرتے رہے۔ ان کی شاعری فن اور آئیڈیالوجی کا حسین امتزاج ہے۔ کیفی زندگی کے حقائق اور اس کے علم سے واقف ہیں۔ اس لئے وہ ایک لمحہ جو بہت قیمتی ہے، جو زندگی کے نازک موڑ پر ہمارے معاشرے اور ملک کے لئے زندگی اور موت کا سوال بن جائے تو وہ لمحہ یقیناً فن سے زیادہ اہمیت کا حامل ہوگا، اسے نظر انداز کر دینا زندگی اور وقت کے اہم تقاضے سے منہ موڑ لینا ہے۔ اور یہ (مفرور) صورت حال فن اور فنکار دونوں کے لئے کسی بڑے خسارے سے کم نہیں۔ شاعر کو وقت کا

نقیب یا پیامبر اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ قیمتی لمحوں کا پارکھ اور اپنے وقت کا نباض ہوتا ہے۔ وقت کی نبض پر انگلی رکھ کر آنے والے وقتوں کا مزاج بتاتا ہے۔ کوئی وقت یا کوئی لمحہ اس بات کا متقاضی ہے' کہ وہ ماضی کا کوئی حصہ بننے سے پہلے شاندار مستقبل کا پیش خیمہ بن جائے' تو کیا وہ لمحہ اور وقت صرف اس لئے ضائع کر دیا جائے کہ اس کے اظہار پر شاعری کا رتبہ کم ہو جائے گا یا صحافتی اور لمحاتی شاعری کا لیبل لگ جائے گا۔ اگر ایسا ہے تو پھر یہ قول غلط ثابت ہوگا کہ شاعر وقت کا نقیب اور پیامبر ہوتا ہے۔ یہ ادب کے نام پر ادب اور زندگی سے ایک قسم کی بددیانتی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

کیفی کی شاعری میں تین چیزیں نمایاں طور پر محسوس کی جا سکتی ہیں۔ داخلی واردات' خارجی تجربات اور زندگی کے مشاہدات۔ کیفی کی شاعری مذکورہ عناصر کی بہترین ترجمان ہے۔ انہوں نے اپنے تجربات' واردات اور مشاہدات کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر کے زندگی کے متنوع پہلوؤں سے جوڑ دیا ہے۔ شاید اسی لئے ان کی پوری شاعری کل سے زیادہ آج سے قریب اور بامعنی معلوم ہوتی ہے' اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں شخص' زمانہ اور فن ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ کیونکہ ان کا ایک مضبوط رشتہ مذکورہ توانا عناصر سے آج بھی قائم ہے۔ کیفی کی شخصیت داخلی و خارجی دونوں اعتبار سے بہت متوازن ہے۔ اگر یہ توازن ہی کسی کی داخلیت اور خارجیت میں نہ ہو تو اس کے ہونے کا ڈھونگ کوئی کب تک رچے گا؟ اور عوام یا سماج سے اس کی ریاکاری کب تک چلے گی؟ یقیناً ایک نہ ایک دن عوام اس سے بیزار ہو جائیں گے اور وہ خود سے بھی۔ کیفی نہ صرف قول سے بلکہ عمل سے بھی آخری سانس تک ترقی پسند رہے۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ظاہر پرستی انسان کو ثابت قدم نہیں رکھتی۔ کیفی زندگی کے کسی موڑ پر ظاہر پرستی کے شکار نہیں رہے۔ اگر یہ جھوٹ ہے تو کیفی فنکار نہیں دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے عظیم اداکار تسلیم کئے جائیں گے۔ کیونکہ ظاہر پرستی اور توازن کی کمی (اگر ہے) کے بعد بھی کیفی کی ادبی یا سماجی زندگی میں زوال کا کوئی اثر دور دور تک نظر نہیں آتا اور پھر ترقی پسند شاعری کے حوالے سے ہی ان کی ایک مستحکم شناخت بھی قائم ہے۔

کیفی کی ہر دلعزیزی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کے گفتار و کردار میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔ اگر وہ ادب میں اشتراکیت' انسان دوستی اور محنت کشوں کے ہمنوا ہیں تو اپنی عملی زندگی میں بھی اسی توانا اقدار اور مضبوط روایت کے پاسدار ہیں۔ ان کا موقف خواہ ادب ہو یا زندگی' بالکل صاف ہوتا ہے۔ ان کے قول و فعل میں ہم آہنگی ہے' ان کی شاعری میں اخلاق' اخلاص اور سچائی کا عنصر نمایاں ہے۔ کیفی جس بات کو کہتے ہیں پوری قوت سے کہتے ہیں۔ وہ ایک پر اعتماد رجائی لب و لہجے کے شاعر ہیں۔ افسردگی' بیزاری اور زندگی سے فرار کا کوئی تصور ان کے یہاں نظر نہیں آتا۔ کیفی کا وصف خاص ان کی

صاف گوئی ہے۔ فیض نے ان کی صاف گوئی اور مسلک شعر کے سلسلے میں کہا تھا:

"جیسی سفاک اور بے رحم زندگی ہمارے گردوپیش موجود ہے۔ اس کی بے کم و کاست منظرکشی کیفی کا مسلکِ شعر ہے۔ نہ تلخی مضمون سے گھبراتے ہیں۔ نہ تلخی کلام سے گریز کرتے ہیں' نہ زہر کو قند بنا کر پیش کرنے کے قائل ہیں' نہ قند کی حقیقت سے انکاری اور اس کے باوجود کیفی کی شاعری زہر اور قند کا ملغوبہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک متوازن ٹھہرے ہوئے دردمند' فکرانگیز اور حساس نظریۂ حیات وفن کا بلیغ اظہار ہے۔"[۱]

کیفی کی شاعری پیچیدگی' مبہم علامت گاڑھی ترکیب اور بوجھل ابہام سے پاک ہے۔ اس لئے ان کی شاعری غلو سے کوئی سروکار نہیں رکھتی' ان کے یہاں سادگی ایسی ہے کہ شعر کی ترسیل بغیر ذہنی کثرت کے ہر عوام وخواص تک ہو جاتی ہے۔ اس سادگی میں قنوطیت نہیں رجائیت اور جوش ہے' جو انسانی جبلت میں ایک بے چینی اور حرکت پیدا کرتی ہے۔ محاکات اور پیکر تراشی کو ایسی گویائی عطا کرتے ہیں کہ تصویریں بولنے لگتی ہیں۔ تلمیحات ان کی شاعری کا خاصہ ہیں' جیسے کائنات آنکھ کے تل میں مقید ہوگئی ہو۔

شاید اسی سادگی اور صاف گوئی کی وجہ سے ان کی شاعری کو statement کی شاعری بھی کہی جاتی ہے۔ جن لوگوں نے اسے یہ نام دیا ہے وہ شاعری میں ابہام کی خصوصیت کو شاعری کا بنیادی جزو تصور کرتے ہیں' اور اسی جملے کو متواتر دہراتے ہیں۔ Art lies in the concelment of Art ممکن ہے یہ فقرہ ان کی ذہنی تسکین کا باعث ہو' لیکن اسے کوئی کلیہ قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ کیفی نے اپنے آرٹ کو صاف گوئی سے عوام کے سامنے رکھا ان کا کلام بلاشبہ ڈرائنگ روم میں مدھم سروں میں گنگنانے کا نہیں ہے' وہ بڑی آبادی اور سامعین کی ایک بڑی تعداد کے سامنے پڑھی جاتی ہے۔ یہ کیفی کے محبوب ہیرو ہیں جنہیں کیفی عوام کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان میں ممکن ہے اہل دانش نہ ہوں' لیکن ان کے دل کیفی کے ساتھ دھڑکتے ضرور ہیں۔

عوام کی آواز اور ان کے لب و لہجے سے کیفی نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ نظریاتی آویزشوں کے زمانے میں ان کے قدم یا ایمان اسی لئے نہیں ڈگمگائے کہ ان کے پیچھے عوام کی ایک بھیڑ کھڑی تھی' کیفی نے اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ شاید اسی لئے ہمیں ان کے یہاں کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں

ملتی۔ شاعری میں علامتوں کا مقام ہے۔ اسرار و رموز کی جگہیں ہیں' میں ان کا منکر نہیں' مگر جب مقاصد بلند ہوں اور ان کی حیثیت سماجی نوعیت کی ہو' تو شاعری کے طلسم نئے پیکر میں ڈھل جاتے ہیں' اور وقت کے تقاضے ایسے کلام کا مطالبہ کرتے ہیں جو براہ راست عوام تک پہنچ سکے' تا کہ وہ اس سے Inspiration حاصل کر سکے۔ اسی لئے کیفی کی شاعری بیانیہ بھی ہے اور کشف و کرامات سے پاک بھی۔

ایک ایسے حالات میں جب ہندوستان پر بپتا پڑی ہو اور پورا ہندوستان جل رہا ہو' ہر طرف افراتفری' قتل و غارت گری' وحشت کا ننگا ناچ' تباہی و بربادی مقدر میں لکھ دی گئی ہو' ہر آدمی ڈرا اور سہا ہوا ایک دوسرے سے بے حد خائف ہو' ایسے حالات میں کیا ادب کا تقاضا صرف فنی لوازمات کو پورا کرنا' ذات کے خول میں بند ہو کر نوحہ کناں ہونا' خیالی لیلاؤں کا سراپا بیان کرنا' عین ادب ہے؟ تو ایسے مردہ ادب اور مردار ادیب سے عوام کا کیا واسطہ' مسلک عوام میں دونوں حرام ہیں۔ ادب کے نام پر عوام سے دھوکا دھڑی کے الزام میں ایسے ادیبوں کو جس نے عوام کو گمراہ کیا' زندگی کے تلخ حقائق سے چشم پوشی کی اور گرد و پیش کے حالات سے عوام کو روبہ رو کرنے کے بجائے فرار کی ترغیب دی' انہیں تعزیرات فن کے تحت ادب کی رو سے نو دو گیارہ ہونے کے الزام میں ہماری عوامی تنقید انہیں سزائے موت کا حکم سنا چکی ہے۔

کیفی اپنی نظموں میں مواد کو ہیئت میں ہیئت کو مواد میں اس طرح پروتے چلے جاتے ہیں۔ جیسے کوئی انسان اپنے عہد کی سچائیوں کو بھوگ رہا ہے اور پھر اپنے تجربات بیان کر رہا ہے اور شعر ان صداقتوں کو سمیٹنے کے لئے جیسے اپنا دامن پھیلائے کھڑا ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کیفی کی رومانیت اس رومانیت سے مختلف ہے' جو فیض کی شناخت ہے' جو مخدوم' سردار اور دوسرے ترقی پسند شاعروں کے یہاں مختلف شکلوں میں ملتی ہے۔ کیفی کے یہاں زندگی اور انقلاب' بے چینی اور تڑپ کی پوری نوعیت سماجی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں بلند آواز سے سوچنے کی ایک کیفیت موجود ہے۔ جب کہنے والے کے پاس کوئی بڑا پیغام نہ ہو' شاید تبھی وہ پراسرار ابہام کا سہارا لیتا ہے۔ لیکن جب کچھ کر گزرنے کا جذبہ ہو۔ اور Communication کی خواہش شدید ہو تو یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ گفتگو براہ راست ہوتی ہے' جہاں لہجہ کبھی نرم اور کبھی گرم ہو جاتا ہے۔ کیفی کی شاعری ان کے عہد کی آئینہ دار ہے' جس کا سرا ایک دوسرے سرے سے اس طرح جڑا ہے کہ ہم بہت آسانی سے کسی مخصوص دہائی کو پہچان لیتے ہیں۔

کیفی کے سلسلے میں یہ کہنا غلط ہے کہ ہر جگہ احتجاج ہی سنائی دیتا ہے کیفی کی شاعری احتجاجی ضرور ہے مگر یہ احتجاج محض جذباتی نہیں ہے' بلکہ روشن مستقبل کی نوید بھی دیتا ہے' یہ احتجاج زندگی کی علامت ہے' اگر آپ غور سے اس احتجاج کا تجزیہ کریں تو اس میں آپ کو عصر کی بے چینی' غربت' جہالت'

استحصال اور نا آسودگی نظر آئے گی۔ شاعری ناول یا افسانے کا فن نہیں ہے' جس میں جزئیات نگاری بھی شامل کی جائے۔ شاعری کیفی کے یہاں بلند آواز سے سوچنے کا ایک ذریعہ ہے' اور وقت کا تقاضا ہی ان کے احتجاج کے ریشے ریشے میں سمایا ہوا ہے۔ جو کیفی کا امتیازی وصف ہے۔ کیفی کو اس کا دکھ نہیں ہے کہ انقلاب کیوں نہیں آیا۔ وہ دراصل انقلاب کی پیچیدگیوں سے واقف ہیں اور فراق کے اس شعر پر بھی ان کی نظر ہے:

دیکھ رفتار انقلاب
کتنی آہستہ اور کتنی تیز

سقوط ماسکو اور کمیونسٹ پارٹی کے ٹوٹنے بکھرنے کے بعد ان کے حمایتی اور معاونین کے قدم لڑکھڑا گئے' ان کو وقتی طور پر تھوڑی رسوائی کا سامنا بھی کرنا پڑا' جن لوگوں نے سرخ پرچم بلند کیا تھا۔ کیفی بھی اس حادثے سے متاثر ہوئے' اور نہ صرف کیفی بلکہ تمام ترقی پسند شعرا اور ان کے کلام کو آڑی ترچھی نظر سے دیکھا گیا اور ہدف بھی بنایا گیا۔ ان کی سیاسی بلند آہنگی پر لوگ نکتہ چیں بھی ہوئے' جس سے ترقی پسند شعراء کی شاعری متاثر بھی ہوئی' کچھ شعراء نے اس حادثے کے بعد کنارہ کشی اختیار کر لی۔ مگر کیفی ان نامساعد حالات میں بھی اپنے محاذ پر ڈٹے رہے اور آخری دم تک اپنے مقام پر قائم رہے۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ سیاست یکساں چال سے گردش نہیں کرتی' کبھی کبھی اپنا محور بدل بھی دیتی ہے' اور یہ بات اشتراکیت کے زوال سے ثابت ہو چکی ہے۔ اشتراکیت سے' استحصال زدہ عوام اور مظلوموں سے جن کا رشتہ زبان کا نہیں دل کا تھا وہ اب اپنی جگہ قائم ہیں۔ گرچہ ان کے خواب پورے نہیں ہوئے' تو ختم بھی نہیں ہوئے۔ وہ آج بھی ایک خوش آئند زندگی کی آرزو رکھتے ہیں۔ اور یہی آرزو انہیں کبھی اپنے موقف سے ہٹنے نہیں دیتی ہے۔ وہ آج بھی اپنا علم اٹھائے ہوئے ایک روشن مستقبل کا تمنائی ہے۔ اگر یہ آرزو اور تمنا انسان دوستی نہیں صرف سیاست ہے' تو بھی کیفی کی سیاسی ایمانداری پر شک کی کوئی گنجائش کہاں باقی رہ جاتی ہے؟

ترقی پسندی کیفی کے یہاں بندھے ٹکے فارمولوں کی شکل میں دکھائی نہیں دیتی' مصلحتوں اور سمجھوتوں کا نام ترقی پسندی نہیں ہے۔ کیفی بنیادی طور پر ایک ایسے ترقی پسند شاعر ہیں' جن کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ایک طرح کا بانکپن بھی ملتا ہے۔ یہ بانکپن انانیت کی قبا نہیں پہنتا ہے' بلکہ اس انسان دوستی اور خلوص کے دھاگوں سے بنی ملبوسات میں نظر آتا ہے' جو ایک نیک دل انسان اور باشعور انسان کی شناخت بن جاتا ہے۔

عورت شاعروں کا ایک محبوب موضوع رہی ہے۔ فنون لطیفہ سے وابستہ ہر فنکار اس کی مرکزیت

کا قائل ہے اور اسے حسن کا سرچشمہ سمجھتا ہے۔ کیفی کے یہاں عورت جنسی تکمیلات کا ایک ذریعہ نہیں ہے۔ وہ کوئی تقدس مآب شئے بھی نہیں' بلکہ کیفی کے یہاں عورت ایک ایسی رفیق حیات کے طور پر ابھرتی ہے' جو مردوں کے شانہ بہ شانہ جدوجہد میں شامل ہے۔ یہ عورت علم اور محنت کی وجہ سے ایک آئیڈیل کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ انسانیت کا وقار ہے۔ اس کی دلکشی ہمارے عہد کی خوبصورتی بن جاتی ہے' اس کا حسن کائنات کے اس حسن کا ایک حصہ بن جاتا ہے' جو ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ اس کی ادائیں ہوسنا کی سے مختلف ہیں اور معصومیت سے قریب ہیں۔ جو اسے فطرت سے ملی ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز میں کیفی عورت کو مستقل مزاجی کی ایک علامت تصور کرتے ہیں۔ وہ ان کے یہاں کسی پرچم کی محتاج نظر نہیں آتی' بلکہ انقلاب کی علامت بن کر اس کا مکمل وجود ہی پرچم کشا بن جاتا ہے' یہ فرق دوسرے ترقی پسند شعراء اور کیفی میں معنی خیز ہے۔

ترقی پسند ادب نے روایت کے فرسودہ خیالات کو جہاں ترک کیا' وہیں نئے تصورات اور رجحانات سے اردو ادب کو روشناس بھی کرایا' آہ و زاری' ذات و کائنات کی بے ثباتی' محبوب کی فرقت' اور زندگی کی ویرانی سے انہیں نکال کر زندگی کا اصل روپ دکھایا' صبح فردا کے خواب دکھائے اور عورت کو ایک چہرے سے آزاد کر کے ہزار چہرے عطا کئے۔ اب عورت محض جنسی لذت کا وسیلہ نہیں رہی۔ عورت کو زندگی کی جدوجہد میں شامل کر کے اسے نہ صرف باوقار بنایا گیا' بلکہ ایک مریمی وقار بھی عطا کیا گیا' اور اس طرح گھٹ گھٹ کر زندگی جینے والی عورت نے کہیں مشعل راہ' کہیں سنگ میل' کہیں پڑاؤ اور کہیں منزل کی حیثیت اختیار کر لی۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکا جب عورتوں نے خود کو تاریکی اور جہالت کی دنیا سے آزاد کیا۔

کیفی آزادئ نسواں کے قائل ہیں' وہ اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ بے جا پابندی عورتوں کو گھن لگا دیتی ہے' اور اس کی شخصیت و انفرادیت بھی اپنی موت آپ مر جاتی ہے۔ کیفی نے بلاشبہ اردو شاعری کو عورت اور اس کی تہہ دار شخصیت کا ایک صحت مند تصور دیا' جو کہ خالص ہندوستانی ہے۔ ہندوستانی پس منظر میں عورتوں کے معصومانہ کردار کے کئی پہلو' کیفی کی نظموں میں ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔

رومانیت کے بغیر کوئی ادب تخلیق نہیں ہوتا' ہر ادیب و شاعر کے یہاں اس کا ایک مخصوص کردار ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی شراب ہے جسے عابد و زاہد سب پیتے ہیں۔ کیفی کی رومانیت مفلوج یا بیمار نہیں ہے' بلکہ ایک صحت مند دل و دماغ کی رومانیت ہے۔ یہ ایسی رومانیت ہے جو زندگی کا اعتبار بڑھاتی ہے' اور ہمیں زندگی کے کسی موڑ پر بے ثباتی عالم کا احساس نہیں دلاتی۔ اس رومانیت کا دائرہ کیفی کے یہاں بہت وسیع ہے۔ کہیں وہ ایک نئی دنیا کی تلاش کی طرف اشارہ کرتی ہے' کہیں جذبۂ ناآسودگی کی طرف'

کہیں اپنا حق چھین لینے کی دبی دبی انسانی فطرت کی طرف۔ یہ رومانیت' قوت بن کر کیفی کی شاعری میں بکھری ہوئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ بسا اوقات فکر کی اس عمارت کو منہدم کر دیتی ہے' جہاں مصلحتوں کی اینٹ اور گارے بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ یہ ہتھیار اور حربے کی شکل میں کیفی کے یہاں موجود ہے۔ دوسرے ترقی پسند شاعروں نے جوش کی رومانیت سے استفادہ کرتے ہوئے' اپنے خوابوں اور خیالوں کی دنیا بسائی ہے۔ کیفی بھی خواب دیکھتے ہیں اور آرزو کے محل تعمیر کرتے ہیں' لیکن وہ یہ کبھی نہیں بھولتے کہ وہ خاکی ہیں اور ان کا ہر خواب کسی نہ کسی سماجی عمل کا متقاضی ہے۔ اسی لئے کیفی کی رومانیت کو میں نے ایک باشعور دل و دماغ کی رومانیت سے تعبیر کیا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ بعضوں نے ان کی رومانیت کو حقیقت پسندی کی طرف گریز سے تعبیر کیا ہے' ممکن ہے ایسا ہو لیکن میرے نزدیک تو وہ کل بھی حقیقت پسند تھے اور آج بھی ہیں' فرق صرف زبان و بیان کا ہے اور الفاظ کی سماعی قوت کا' ان کی فکر میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہے' یا کسی طرح کا دانستہ گریز بھی نہیں ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں علامتوں کا استعمال کم سے کم ہے' تجریدی واہمہ بھی نہیں ملتا اور دفوری کرشمہ سازیاں بھی دکھائی نہیں دیتیں۔ مجھے فنی کمالات کے ساتھ صرف سماجی اور سیاسی بصیرت کی ایک تیز لہر کیفی کے یہاں ملتی ہے' جو ان کی قوت متخیلہ کا ساتھ دیتی ہے اور یہی ان کا تخلیقی محرک ہے۔

کسی کی شاعری کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو لازماً شاعر کے حالات زندگی اور اس کے عہد کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاکہ اشعار کے معنی و مفہوم واضح ہو سکیں۔ ہمارے پاس شعر کو پرکھنے کا ایک پیمانہ یہ بھی ہے' اور اسی روشنی میں شعر کے بہت سے پہلو بھی اجاگر ہوتے ہیں اور اس طرح اس کے معائب و محاسن سامنے آتے ہیں۔ شاعر یا اس کے کلام کو پرکھنے کا ایک پیمانہ نظریۂ حیات بھی ہے' اور اس عمل میں ہم دیکھتے ہیں کہ شاعر کس نظریئے سے تعلق رکھتا ہے اور وہ اپنے نظریئے کو کتنی کامیابی کے ساتھ فنی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے پیش کرتا ہے۔

کیفی کی شاعری کو عہد' حالات اور نظریئے کی کسوٹی پر رکھ کر جب ہم دیکھتے ہیں' تو کیفی نہ صرف کامیاب شاعر بلکہ ایک کامیاب انسان بھی نظر آتے ہیں۔ ہر شاعری کو میر اور غالب کے شعری پیمانوں سے جانچنا درست نہیں' کیونکہ ان کے دور کا مزاج دوسرے دور کے مزاج سے مختلف ہوگا۔ کیفی کا دور تہذیبی شکست' سیاسی شدت اور معاشی بحران کا دور تھا' ان کے کلام کا تجزیہ یا مطالعہ اسی حوالے سے مناسب بھی ہے اور درست بھی۔

کیفی کی شاعری کی ابتداء غلام ہندوستان میں ہوئی اور آج وہ ایک ایسے مقام پر کھڑے ہیں'

جہاں دنیا کی تمام سرحدیں ملتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اور بیشتر ممالک براہ راست غلامی سے نجات پا چکے ہیں۔ اس دوران کس پر کیا بیتی۔ کیفی کی شاعری اس کی چلتی پھرتی تصویر ہے۔ اسی لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ جہاں اس کا ایک حصہ ہمارے ادبی و تہذیبی نگارخانے کی زینت ہے' وہاں بقیہ اجزاء تاریخی اور سماجی اہمیت کے حامل ہیں۔

جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ کم علم ہیں اسی لئے ان کی شاعری میں فکر کا جذبہ نہیں ملتا۔ وہ شعر کی ماہیت سے ناواقف ہیں اور انہیں اس کا بھی علم نہیں کہ علم کی حدیں کتنی وسیع ہوتی ہیں' انہیں یہ بھی جانکاری نہیں کہ محض علم سے شاعری نہیں ہوتی۔ کیفی کا علم اتنا ادھورا یا ناقص نہیں ہے کہ ہم ان پر انگلی اٹھا سکیں۔ کیفی کو علم کا سچا عرفان حاصل ہے' ثبوت کے لئے ان کا سوچتا ہوا ذہن کافی ہے۔

اقبال نے اپنی شاعری میں بے شمار مقامات پر خون جگر کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ یہ الفاظ نہ صرف پُر معنی ہیں بلکہ ان کی شاعری کا عام جزو ہے' مگر یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کی تلاش ہر شاعری میں کی جائے' باوجود اس کے کیفی کا شعری نقش خونِ جگر کے بغیر نا تمام نظر نہیں آتا اور اگر اس سے مطلب یہ ہے کہ شاعر کے خلوص کا اور اس کے جذبے کی صداقت کا اندازہ لگایا جائے تو بلاشبہ یہ کیفیت بھی کیفی کی شاعری میں موجود ہے۔

بعض حلقے سے یہ آواز سنائی دیتی ہے کہ کیفی کی شاعری فکر اور فلسفے سے محروم ہے۔ بعض حلقے سے یہ بھی آواز آتی ہے کہ ان کے یہاں نظریاتی فکر زیادہ ہے۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ شاعری کا مقصد کسی فلسفے یا فکر کو پیش کرنا نہیں ہے' بلکہ فکری صلاحیتوں کو مہمیز کرنا ہے اور فلسفیانہ نکات کو روشن کرنا ہے۔ وہ کام کیفی نے بخوبی انجام دیا ہے۔ اسی لئے سردار جعفری نے کیفی کو اردو شاعری کا 'سرخ گلاب' کہا۔ جو ایک نظر میں محبوبہ کے رخسار کی سرخی میں بدلتا ہے اور دوسرے ہی پل ہمیں خون شہیداں کی یاد دلاتا ہے۔ اس طرح آپ دیکھیں تو کیفی کی شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ راقم الحروف کا احساس ہے کہ کیفی ترقی پسند ادب کا ایک اہم ستون ہیں جس پر آنے والی نسل کی ادبی و تہذیبی عمارتیں تعمیر ہوں گی۔

■

حوالہ جات و توضیحات :

۱۔ آوارہ سجدے' مجموعہ کلام۔ پیش لفظ۔ فیض احمد فیض۔ ص ۷-۸

محاکمہ

- اردو نظم کی خصوصیات اور کیفی اعظمی
- اہل نظر اور کیفی اعظمی